روحِ غالب

مرتّبہ

سیّد محی الدین قادری زورؔ

تحفہ ادارہ
سید محمد الرحمٰن دوراں ادارہ
۲۶-۱-۷۹

سلسلۂ مطبوعات اِدارۂ ادبیاتِ اُردو۔ شمارہ (۲۱)

روحِ غالب

یعنے

اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب

مرزا اسداللہ خاں غالب نظام جنگ نجم الدّولہ دبیر الملک

کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب

معہ پیش لفظ

مولوی سیّد مہدی حسین بلگرامی نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج)

صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ

مرتبہ

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد میں چھپکر دفتر "ادارہ" رفعت منزل
خیرت آباد سے شائع ہوئی

۱۹۳۹ء ——— صفحات ۲۴۰ ——— قیمت عالیہ

مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ نجم الدولہ دبیر الملک

فہرست مندرجات

پیش لفظ

دیباچہ مرتب

(۱) غالب کے متعلق ادب

(۲) حیات غالب

(۳) غالب کے ادبی کارنامے

(صفحات ۳۱ تا ۴۷)

(۴) غالب کے اعزہ واحباب

(صفحات ۴۸ تا ۶۴)

(۵) خطوط غالب کے دلچسپ ادبی حصے

(صفحات ۹ تا ۱۷۵)

پیش لفظ

از عالی جناب آنریبل مولوی سید مہدی حسین صاحب بلگرامی نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج)

صدر المہام تعلیمات ممالک محروسہ و معین امیر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے کلام کو اس ملک میں جتنی مقبولیت حاصل ہے اتنی کم کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہوگی ۔ ان کی کلیات نظم و نثر ۔ فارسی اور اردو کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں جن میں بعض بہت نفیس اور پر تکلف بھی ہیں ۔ کئی ایک شرحیں ان کے دیوان کی لکھی گئیں جن میں بعض بہت فاضلانہ ہیں اور سوانح ان کی حیات کے شائع کئے گئے ۔ اس پر بھی لوگوں کی طبیعت سیر نہیں ہوئی اور اب بھی ان کے متعلق کتابوں اور مضامین کی طلب باقی ہے ۔ اور آئے دن اس لٹریچر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔

مولوی سید محی الدین صاحب قادری زور نے " روح غالب " کے عنوان سے جو کتاب تالیف کی ہے مجھ کو یقین ہے کہ اردو ادب کے قدردان اس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے ۔ اس میں انھوں نے غالب کے متعلق جو کتابیں پیشتر شائع ہوئی ہیں اور ان کے دیوان کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں ان کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور اسی طرح مختصر الفاظ میں ان کی سوانح عمری بھی درج کی ہے ۔ نیز ان کی مختلف تصانیف پر سرسری نظر ڈالی ہے اس کے بعد اصل کتاب میں غالب کے مشہور رقعات کا انتخاب درج کیا ہے جو اس وقت بھی اردو روزمرہ اور اردو رقعہ نویسی کا بہترین نمونہ ہیں ۔ غالب کے خطوط سے خاص طور پر ان کے کیرکٹر اور عادات و اخلاق پر روشنی پڑتی ہے

اوران کی زندہ دلی، دوستوں سے حسن سلوک اور شاگردوں سے مشفقانہ تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس معنے میں یہہ تالیف واقعی اسم بامسمیٰ ہے کہ اس میں غالب جیسے ع "پاک دل پاک ذات پاک صفات" انسان اور صاحبِ کمال شاعر کی روح پھونک دی گئی ہے۔

یہاں پر چند کلمے بطور انتباہ کے لکھ دینا ضرور ہے۔ یہہ جاننا چاہیئے کہ ہر قوم کا لٹریچر اس قوم کے تمدن طرز معاشرت حالات روایات خیالات وغیرہ کا نتیجہ بلکہ ان سب چیزوں کا آئینہ ہوتا ہے، لہذا کسی شاعر کے کلام کو ان سب باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے محض کسی دوسری قوم کے معیار پر جانچنا درست نہیں ہوسکتا جس کا تمدن اور جس کے حالات بالکل جداگانہ ہوں۔ کہ ایسا کرنا اسی قدر غلط ہوگا جیسے مثلاً کوئی شخص شکسپیر کی تنقید میر و سودا کے زاویۂ نگاہ سے اور دلی اور لکھنو کے طرز معاشرت یا وہاں کے قدیم حالات کے لحاظ سے کرے۔ چنانچہ ایسی ہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو غالب کے کلام کی تنقید مغربی معیار سے کرتے ہیں ۔

واقعہ یہہ ہے کہ غالب کا کلام سمجھنے اور اس سے لطف اٹھانے کے لئے ایشیائی مذاق درکار ہے نہ کہ مغربی۔ حاصل کلام یہہ کہ جن مبصرین نے غالب کے کلام کی تنقید انگریزی نقطۂ نظر سے کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھے ہیں جو اوپر بیان کی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ جیسے جیسے خود قوم کی حالت بدلتی جاتی ہے اسی طرح اس کی شاعری میں بھی تغیر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اکبر اور اقبال نے زمانۂ جدید کے اقتضاء کے مطابق لکھا ہے۔ پھر بھی جب تک خود اردو زبان باقی ہے غالب کا اثر دلوں سے محو نہیں ہوسکتا۔

مہدی یار جنگ

۳۰ رار دی بہشت ۱۳۴۸ف م ۴ ر اپریل ۱۹۳۹ء

مرزا غالب کی اُردو نثر ادبی حلاوت، زبان کی پاکیزگی، اور اسلوب کی شگفتگی کے لحاظ سے اُردو ادب کا شہکار سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس میں بعض حصے ایسے ہیں جن کا مطالعہ صرف علم و فضل سے تعلق رکھنے والوں ہی کے کام آسکتا ہے، اور جو لوگ غالب کے محض پاکیزہ اسلوب اور خوبی تحریر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اُن کو اِن خطوط کے علمی مباحث اور فنی مسائل کی وجہ سے جگہ جگہ اُلجھنا پڑتا ہے اور اس طرح اسلوب کی شیرینی کے ساتھ مباحث کی یہ ترشی ناگوار خاطر ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اردو کے اِس شہکار سے صرف ایسے شہ پارے چن لئے جائیں جو زبان و اسلوب کے لحاظ سے دلچسپ ہوں، اور ان علمی و فنی بحثوں کو علیحدہ کر دیا جائے جو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لئے کارآمد ہیں نہ کہ غالب کے اسلوبِ خاص سے لطف اندوز ہونے اور اُردو نثر کے پاکیزہ نمونوں سے واقف ہونے والوں کے لئے۔

خطوط غالب کے ان علمی و فنی اجزا کو یوں بھی اِس سے قبل مرزا عسکری صاحب نے علیحدہ کر کے "ادبی خطوط غالب" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے اگرچہ ان کی کتاب کا نام "علمی خطوط غالب" زیادہ موزوں ہوتا۔ جو ادب پارے اب منتخب کر کے پیش کئے جا رہے ہیں یہ صحیح معنوں میں "ادبی" ہیں اور اس کتاب کا نام "ادبی خطوط غالب" زیادہ بہتر تھا مگر یہ نام رکھا جا چکا ہے اس لئے اس مجموعہ کا نام "رح غالب" رکھا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ اس کتاب میں غالب کی نثر کے جو انتخابات شامل ہیں وہ ان کے اُردو مکاتیب کا نچوڑ ہیں، اور ان کے مطالعہ سے غالب کی شخصیت

اوران کی قلبی و روحانی کیفیتیں صحیح معنوں میں بے نقاب ہو جاتی ہیں ۔

علمی و فنی باتوں کے علاوہ اس مجموعہ کے خطوط سے ان عبارتوں کو بھی علحدہ کر دیا گیا ہے جن میں غالب نے حوائج ضروری اور دیگر ایسے امور کا ذکر کیا ہے جو مطالعہ کے لطف میں بدمزگی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے تھے ۔ ان التزامات کی وجہہ سے مکتوبات غالب کا یہہ لطیف و پاکیزہ مجموعہ ہر سنجیدہ اور پاکیزہ ذوق رکھنے والے کے مطالعہ کے قابل ہو گیا ہے ۔

اس کے ساتھ اجمالی طور پر مرزا غالب کے حالات زندگی، تصنیفات و تالیفات، اور خاص خاص اعزہ و احباب و تلامذہ کی نسبت مجمل معلومات بھی پیش کر دی گئی ہیں تاکہ ان خطوط کے سمجھنے میں آسانی اور پڑھنے میں لطف حاصل ہو سکے ۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب شفیق محترم مولوی مرزا حسین علیخاں صاحب ام اے (اکسن) کی تحریک پر عمل میں آئی ہے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی ہمت افزائیاں اس دلچسپ کام کی تکمیل کا باعث ہوئیں ۔ عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر کی توجہہ اور دلچسپی کا ثبوت اس پیش لفظ سے مل سکے گا جو اس کتاب میں مقدمہ کے طور پر شامل ہے ۔ سچ تو یہہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کی اکثر علمی و ادبی کامیابیاں موصوف ہی کے فیضان نظر کی مرہون منت ہیں جس کے لئے تمام اردو دنیا نواب صاحب معظم کی شکر گذار رہے گی ۔

یہہ کام اگرچہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں شروع ہو چکا تھا مگر ترتیب و تکمیل میں ایک سال گذر گیا اور یہہ کتاب ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہو جاتی اگر مرتب کی دوسری مصروفیتیں مانع نہ ہوتیں ۔

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مرزا غالب اردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور بہت بڑے ادیب تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں کوئی اور شخصیت ایسی نظر سے نہیں گزرتی جو نظم و نثر دونوں میں ایسا اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مرزا کی انشاپردازی میں بھی وہی اجتہادی شان موجود ہے جو ان کی شاعری کی جان ہے۔ یہ اصل میں اُن کی فطرت کا اقتضا تھا۔ وہ ہر وقت پُرانی ڈگر سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے۔ لکیر کا فقیر بننا ان سے ممکن نہ تھا۔ اسی ڈیڑھ اینٹ کی علٰحدہ مسجد بنانے کے خبط نے انھیں عمر بھر پریشان حال اور ایک حد تک ناشاد و نامراد رکھا۔ لوگ ان کو مغرور و متمرد اور خود بین و خود رائے سمجھتے تھے۔ لیکن جو خصوصیتیں ان کی زندگی میں ان کی خرابیاں سمجھی جاتی تھیں آج وہی ان کی خوبیاں ہیں!

مرزا غالب نے اردو شاعری میں نیا رنگ اختیار کیا تو لوگ انھیں "بے استاد" کہنے لگے' اور ان کی شاعری کو ع پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال — جیسی شاعری قرار دیا۔ مرزا نے برہان قاطع کی غلطیوں کو وضاحت سے بیان کیا تو ان کے ہم عصر اُن کے درشت لہجہ کو برداشت نہ کر سکے کیونکہ وہ تقریظوں اور مدح سرائیوں کے عادی اور تیسر تر

اسلوبِ تنقید سے نا واقف تھے۔ مرزا غالب نے مرزا قتیل اور واقف کو سب کچھ سمجھنے سے انکار کر دیا تو ان کے بہت سے کرم فرما بگڑ گئے کیونکہ وہ "اعتقاد من بس است" کے قائل تھے اور مرزا غالب پیر اور حس میں فرق کرنا چاہتے تھے۔ غرض غالب کی زندگی انہی مجتہدانہ حیرانیوں میں بسر ہوئی اور ان کے معاصرین ان کی ہر جدت کو "ایجاد بندہ" سمجھتے رہے جس پر ہمیشہ گندہ ہونے کا فتویٰ ملتا رہا۔

لیکن ان کی جملہ قوتوں میں سے اگر کسی پر اعتراضوں اور غلط فہمیوں کی کم بوچھار ہوئی تو وہ اُن کی اُردو نثر تھی۔ حالانکہ یہ بھی ایک بالکل نئی چیز تھی اور محض مرزا غالب کے جدت پسند قلب و دماغ کی پیداوار۔ کیونکہ ان سے قبل مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کے لکھنے کا دور دورہ تھا اور کسی نے ایسی بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ زبان کو قلمبند نہیں کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی نثر اس لئے ہدف ملامت بننے سے بچ رہی کہ ابتدا میں خاص خاص اصحاب ہی کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اور عوام کی یہاں اُس وقت رسائی ہوئی جب غالب بہت بوڑھے ہو چکے تھے، مقابلوں اور مخالفتوں کی آندھیاں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی قدر و منزلت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ اس وقت شائع ہوا جب ان کی شمع زندگی جھلملا رہی تھی اور وہ تعریف و قدر افزائی سے یکسر بے نیاز ہو چکے تھے۔

یہ بھی فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اکثر اس وقت انسان کو شہرت اور عزت و مقبولیت نصیب ہوتی ہے جب وہ اس سے مستفید ہونے کے قابل نہیں رہتا یا جب کہ اس کو اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

غالب کے متعلق ادب

ابتدائی کوشش

مرزا غالب کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ لکھی جائینگی اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ان کی شہرت اور عظمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ سب سے پہلے

حالی — مولوی حالی نے اُن کے اجمالی سوانح حیات اپنی مشہور کتاب "یادگار غالب" میں شائع کئے۔ یہ کتاب غالب کی پہلی حیات اور حالی جیسے ادیب کی تصنیف ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اردو ادب کا شہکار سمجھی جائے گی۔ لیکن اس میں مصنف نے اپنے ماحول کے اقتضا سے غالب کے کلام پر اتنا زور دیا ہے کہ ان کی زندگی کے حالات تشنہ رہ گئے۔

مولوی حالی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مرزا غالب کے قلب و دماغ کی خوبیوں اور خاص کر ان کے خداداد ملکۂ شاعری کی خصوصیتوں سے اپنے ہم عصروں کو واقف کریں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ آج مرزا غالب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا ایک بڑا سبب مولوی حالی کی کوشش بھی ہیں۔

آزاد — حالی کے علاوہ آزاد نے بھی اُسی دور میں "آبِ حیات" میں مرزا غالب کا تذکرہ لکھا لیکن وہ اپنے اسلوب کی آرائش و زیبایش اور الفاظ کے بنانے اور سدھارنے میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ اصل موضوع کی طرف زیادہ توجہ کرنے نہ پاتے۔ وہ معنی سے زیادہ الفاظ و

سلوب پر زور دیتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب میں تاریخی سقم باقی رہ گئے۔ غرض حالی اور آزاد
نے غالب کے حالات زندگی اور ان کی شخصی یعنی قلبی و روحانی کیفیتوں کے بیان کو جس طرح
تشنہ چھوڑ دیا وہ اسی طرح نامکمل رہا اور شاید ہمیشہ رہے۔ کیونکہ ان بزرگوں کو معلومات کے جو
ریعے حاصل تھے وہ ان کے دور کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سانپ نکل گیا اور اب ان معلومات کو
اصل کرنے کی کوششیں لکیر پیٹتے رہنے سے زیادہ سودمند نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ اس خصوص میں بعض اصحاب نے بعد کو عجیب و غریب تحقیقیں کی ہیں اور مرزا
کے کلام کے ذریعہ سے ان کو سیاسی مدبر، مصلح قوم، آزادئ ہند کا علمبردار، انگریز گورنمنٹ کا
خوشامدی اور جاسوس، غرض وہ سب کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو وہ قطعاً نہیں تھے۔
اس قسم کی کوششوں کو لکیر پیٹنا نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

حیدر یار جنگ طباطبائی

حالی کی یادگار کے بعد یوں تو غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی
بیسیوں کوششیں کی گئیں اور ہر شارح نے اپنی اپنی بساط کے مطابق
مرزا کے اردو دیوان کی شرح لکھی لیکن مولانا علی حیدر نظم (حیدر یار جنگ) طباطبائی نے جو شرح
دیوان غالب" لکھی وہ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اس سے پہلے کسی اردو شاعر
کے کلام کا اس عالمانہ اور محققانہ شان کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے
اردو کی عزت بڑھا دی۔ اور مرزا غالب کی شاعری کو وہ حقیقی عظمت بخشی جو حالی کی "یادگار غالب"
کے بعد بھی نمایاں نہ ہو سکی تھی۔

دوسری شرحیں

مولانا طباطبائی کی شرح کے بعد سے اب تک متعدد سخن گو اور سخن فہم اصحاب

مثلاً بیخود دہلوی، آسی لکھنوی، نظامی بدایونی، حسرت موہانی، قاضی سعید احمد اور سہا وغیرہ نے دیوان غالب کی شرحیں لکھ کر شایع کیں لیکن ان میں سے کسی کی شرح طبا طبائی کی "شرح دیوان غالب" کے پایہ کو نہ پہنچ سکی۔

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری

ان شرحوں کے علاوہ ضرورت تھی کہ غالب کی شاعری پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتی۔ اس کام کو بجنوری مرحوم نے انجام دیا۔ انھوں نے اس مشرقی شاعر کے محاسن کلام پر مغربی طرز کا ایک بسیط تبصرہ لکھا۔ یہ اصل میں قدیم وضع کی ایک طویل تقریظ ہے جو لکھنے والے کی وسعت معلومات اور یورپی طرز تحریر کی وجہ سے اردو میں اپنی قسم کی پہلی چیز نظر آتی ہے۔ اس میں اگرچہ جگہ جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور پوری تحریر بجائے خود ایک نثری شاعری بن گئی ہے لیکن اس کوشش نے غالب کے کلام کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور مغربی تعلیم یافتہ اصحاب کو اس مشرقی شاعر کی طرف خاص طور پر متوجہ کر دیا۔

ڈاکٹر سید عبد اللطیف

ان مغربی تعلیم یافتہ اصحاب میں ایک ڈاکٹر لطیف بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "غالب" مولانا طبا طبائی کے اسلوب میں لکھی ہے۔ یہ اصل میں بجنوری کے "محاسن کلام غالب" کا ردعمل ہے لیکن ڈاکٹر لطیف اپنے خاص نقطۂ نگاہ اور تنقیدی معلومات کی پیش کشی میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ مرزا اور ان کا کلام بہت پیچھے رہ گیا۔ ان کے پیرایۂ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعر کو پیش کرنے کی بجائے اپنے اعلیٰ نظریۂ تنقید کو پیش کر رہے ہیں۔ اور غالب سے واقف ہونے یا واقف کرانے کی جگہ اپنے معیار تنقید پر شاعر کے کارناموں کو اس طرح پرکھنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شاعری نمایاں ہونے کی جگہ گم پس پس کردہ جاتی ہے۔

غالب کے متعلق ادب

سوانحِ عمریاں

غالب کے کلام کو سمجھنے کی کوششوں کے علاوہ گزشتہ چند سال کے عرصہ میں غالب کی تین سوانحِ عمریاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ جن میں پہلی مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے مدیر روزنامہ انقلاب لاہور کی کتاب "غالب" ہے جو رائل سائز کے ۳۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۴ ابواب ہیں اور ہر باب ایک خاص موضوع کے لئے مختص ہے آخری دو باب یعنے تقریباً ۶۰ صفحات مرزا کی تصانیف اور کلام وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ مہر نے حیات کا حصہ زیادہ کر دیا اور کلام کے متعلق کم۔ اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس اثنا میں مرزا کا کلام کافی روشنی میں آچکا تھا۔ اس کے علاوہ مہر نے حالی کی پیدا کردہ بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں "یادگارِ غالب" کے مقابلہ میں مرزا کی حیات اور حالات کے متعلق زیادہ معلومات درج کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی۔

غلام رسول مہر

دوسری کتاب "غالب نامہ" ہے جس کے مصنف شیخ محمد اکرام ایم۔ اے۔ آئی سی ایس ہیں۔ یہ بھی ۱۹۳۶ء میں پہلی کتاب کے چند ماہ بعد شایع ہوئی۔ اس میں غالب کے واقعات زندگی کو زیادہ صحت اور تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

شیخ محمد اکرام

اکرام صاحب نے نہ صرف مولوی حالی کی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی بلکہ ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب میں غالب پر جو اعتراضات کئے تھے ان کے جواب بھی دئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "غالب نامہ" محض ڈاکٹر لطیف کی کتاب کے جواب میں یا ان کی کتاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ اکرام صاحب نے ڈاکٹر لطیف کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور جو کام موخر الذکر نے نامکمل چھوڑ دیا تھا (یعنی تاریخی ترتیب کلام غالب) اس کو اکرام صاحب نے مکمل کرکے غالب نامہ کے آخر میں تقریباً سوا تین سو صفحات میں شایع کیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ڈاکٹر لطیف کے پیش کردہ ادوار سے کچھ اختلاف کیا ہے اور اپنی طرف سے ترمیم کرکے نئے دور قائم کئے اور ان کے تحت مرزا کے کلام کو تقسیم کرکے شایع کیا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر لطیف ہی نے پیش کیا اور اگرچہ وہ اپنا مرتبہ دیوان اب تک شایع نہ کر سکے لیکن اس قسم کی مستحسن کوشش کا سہرا انہی کے سر ہے۔

مالک رام تیسری کتاب "ذکر غالب" ہے جس کو مالک رام صاحب ایم۔ اے نے لکھ کر مکتبہ جامعہ دہلی سے چند ماہ بیشتر شایع کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ چھوٹی سائز کے صرف سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن ایسی جامع و مانع ہے کہ آج تک اردو میں کوئی ایسے اچھے سوانح حیات نہیں لکھے گئے۔ "ذکر غالب" مغربی طرز کی سوانحمریوں کا ایک خوبصورت اور مکمل نمونہ ہے۔ اس میں افراط و تفریط بالکل نہیں۔ ہر مناسب اور ضروری معلومات اس میں شامل ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے جگہ جگہ اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش کا اظہار بھی کیا ہے۔

غالب کے متعلق اتنی مختصر اور مفید کتاب شاید ہی لکھی جاسکے ۔

مہیش پرشاد

غالب اور ان کے کارناموں کے متعلق ایک اور کتاب عرصہ سے زیر ترتیب ہے جو ابھی تک شایع نہیں ہوی ۔ اس کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد اردو و فارسی مولوی مہیش پرشاد مرتب کر رہے ہیں اور ان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ غالب کی جملہ تصنیفات و تالیفات و کلام کے صحیح سنین و تواریخ معلوم کریں ۔ اور اسی تاریخی ترتیب کے ساتھ انھیں مرتب کیا جا رہا ہے ۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک شایع نہ ہوسکا ۔ مہیش پرشاد صاحب نے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کا بھی ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مرزا کے جملہ خطوط کو تاریخ وار ترتیب کے ساتھ شایع کریں ۔

حیاتِ غالب

مرزا غالب ایک تورانی گھرانے میں پیدا ہوئے جو تلاش معاش کی خاطر سمرقند سے ہندستان چلا آیا تھا۔ ان کے دادا پہلے لاہور میں نواب معین الملک کی اور پھر دہلی میں نواب ذوالفقار الدولہ

خاندان

کی سرکار میں ملازم رہے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں دلی میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی دختر عزت النساء بیگم سے شادی کی جن کے بطن سے مرزا ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔

مرزا کے والد نے پہلے حیدرآباد دکن کی اور بعد کو ریاست الور کی فوجی ملازمت کی اور الور ہی میں ایک گڑھی کے زمیندار سے مقابلہ کرتے ہوئے ۱۸۰۲ء میں ان کے گولی لگی اور وہیں مدفون ہوئے۔ مرزا کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار اور آخر میں لارڈ لیک کے لشکر میں رسالدار تھے۔ انھوں نے اپنے مرحوم بھائی کے کمسن بچوں مرزا غالب اور مرزا یوسف کی پرورش اپنے ذمہ لی لیکن پانچ سال ہی میں ۱۸۰۶ء میں وہ بھی کسی معرکہ میں کام آئے۔ اس وقت مرزا غالب کی عمر نو برس سے کم تھی۔

تعلیم و تربیت

سرپرستوں کی وفات نے مرزا کو باضابطہ تعلیم و تربیت سے محروم رکھا اور وہ جلد لہو و لعب میں مبتلا ہو گئے۔ تاہم زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق آگرہ میں مولوی محمد معظم کے مکتب میں کتب متداولہ کی آگاہی حاصل کی اور بعد کو جب ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں ایک پارسی نومسلم عبدالصمد ایران سے ہندستان آئے تو مرزا نے دو برس تک

انھیں اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی صحبت میں فارسی زبان اور ادب کا بڑا اچھا ذوق پیدا کیا اس سے قبل ہی وہ شعر گوئی شروع کر چکے تھے اور مرزا بیدل کے رنگ میں مشق سخن کرتے تھے۔

شادی اور سکونت دہلی

چچا کے تعلق کی وجہ سے وہ یوں تو بچپن ہی سے دلی آیا جایا کرتے تھے لیکن ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (مطابق ۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو ان کی چچا فی نے اپنی بھتیجی امراؤ بیگم دختر مرزا الہی بخش خاں معروف سے شادی کرا دی اس کے دو سال بعد مرزا نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

صحبت کا اثر

دلی میں مرزا کو سسرال کی وجہ سے بڑی اچھی اور شریف صحبتیں نصیب ہوئیں خود ان کے خسر نواب الہی بخش خاں معروف ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ صاحب حال وقال فقیر اور صوفی بھی تھے۔ اور معروف کے بڑے بھائی نواب فخر الدولہ دلاور الملک احمد بخش خاں رستم جنگ والی لوہارو اور دہلی کے خاص امراو عمائدین سے تھے جن کے ایک فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں بڑے عالم و فاضل شاعر اور مورخ تھے۔ غرض غالب کو عنفوان شباب میں اچھی سنجیدہ اور لائق صحبتیں ملیں اور خاص کر اپنے خسر کی وجہ سے تو وہ تصوف و عرفاں سے بھی کما حقہٗ واقف ہو گئے۔ چنانچہ ان کے کلام میں "مسائل تصوف" کا جو بیان ہے وہ حضرت معروف ہی کا فیضان ہے اور بہت ممکن تھا کہ ان بزرگ کے اثر سے وہ ولی بھی سمجھے جا سکتے اگر بادہ خوار نہ ہوتے۔

الہی بخش خاں کے علاوہ مولوی فضل خیر آبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے بھی غالب نے اس زمانہ میں بہت کچھ حاصل کیا اور ان لفظی و معنوی تعقیدوں سے پرہیز کرنے لگے جو انکے

ابتدائی کلام میں بیدل کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ اگر مولوی فضل حق سے ملاقات نہ ہوجاتی تو شاید میر تقی میر کی پیشین گوئی کی دوسری شق پوری ہوتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بھٹک جائے گا۔ طرزِ کلام کی تبدیلی کے علاوہ اس شائستہ صحبت نے مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی اچھا اثر کیا اور وہ لہو ولعب اور رندی و بدمستی ایک حد تک کم ہو گئی جو آگرہ سے آتے وقت ان کی طبیعتِ ثانی بن گئی تھی۔

مالی پریشانیاں

اس صحبتِ صالح کے علاوہ مرزا کے اخلاق کی درستی میں ان کی مالی پریشانیوں کا بھی حصہ ہے۔ مرزا غالب نصراللہ بیگ خاں کے وارثوں میں ہونے کی وجہ سے ان کی جاگیرات سے حصہ پاتے تھے۔ یہ جاگیریں ان کے چچا کے انتقال پر نواب احمد بخش خاں کے علاقہ میں شامل ہو گئی تھیں۔ لیکن جب ۱۸۲۲ء میں نواب گوشہ نشین ہو گئے اور اپنی جاگیروں کو اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا تو مرزا غالب کے حصہ کی تقسیم شمس الدین احمد خاں رئیس فیروزپور کے تفویض ہو گئی۔ موخر الذکر کو ان کے اعزہ کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کیونکہ ان کی والدہ شریف الخاندان نہ تھی۔ مرزا غالب یوں تو پہلے سے ہی ان کے مخالفین میں تھے لیکن اب ان کے برتاؤ اور وقت پر حصہ نہ دینے کی وجہ سے مخالفت بڑھ گئی۔ چنانچہ ان کے خلاف کلکتہ میں مقدمہ دائر کرنے کے لئے اگست ۱۸۲۶ء میں دلی سے نکلے۔ راستہ میں گیارہ ماہ کے قریب لکھنؤ میں قیام کیا اور آخرکار ۴ر شعبان ۱۲۴۲ھ (م ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء) کو کلکتہ پہنچے۔

کلکتہ میں

اس سفر سے اگرچہ غالب کو معاشی فائدہ نہ ہوا اور وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہے یعنی فیصلہ ان کے خلاف ہوا لیکن تین سال تین ماہ کے اس سفر میں انھوں نے

بہت سے سبق سیکھے۔ خود کلکتہ میں مرزا کا ایک سال نو ماہ تک قیام رہا اور وہاں کی فضا انھیں اتنی پسند آئی کہ انھوں نے ایک خط میں لکھا، اگر میں متاہل نہ ہوتا اور خانہ داری کی ذمہ داریاں راہ میں حایل نہ ہوتیں تو مدت العمر کلکتہ میں ہی رہ جاتا۔

کلکتہ اس وقت ہندستان کا پایہ تخت تھا۔ بازاروں کی چہل پہل، یوروپین عورتوں کی بے پردگی اور رنگارنگ شراب کی ارزانی اور کثرت ایک رند مشرب شاعر مزاج کے لئے جنت ارضی سے کم نہیں۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے غالب کے ایک پیشرو شاعر ولی اور تنگ آبادی کو بندرگاہ سورت کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس وقت سورت کا وہی عالم تھا جو عہد غالب میں کلکتہ کا تھا یہی وجہ ہے کہ جہاں ولی نے سورت کے لئے :—

اہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جادے جس کے دیکھے سب کدورت
شہر جوں منتخب دیوان ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

لکھا، غالب نے کلکتہ کے متعلق لکھا ہے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مرزا کا سارا وقت کلکتہ میں عیش و آرام ہی میں گذرا۔ ان کے دوران قیام میں وہاں ایک دلچسپ ادبی ہنگامہ بھی برپا ہوا جس نے غالب کو بڑا پریشان کر دیا۔ یہ ہنگامہ محض

مرزا کی مجتہدانہ شان اور طبیعت کی آزادہ روی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ انھوں نے ایک خاص مشاعرہ میں
جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا قتیل اور واقف کو ہندستانی فارسی داں کہہ کر ان کی سند قبول
کرنے سے انکار کر دیا اور قتیل کے متعلق (جن کی لیاقت، سخنوری اور زباں دانی کا سکہ اس عہد کے
جملہ فارسی ادب کے ذوق رکھنے والوں پر بیٹھا ہوا تھا) مرزا نے یہاں تک کہہ دیا: "وہ فرید آباد کا
کھتری بچہ؟ میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔" یہ غیر شایستہ جملے اور خاص کر قتیل کے معتقدوں
کے سامنے بالکل بے محل تھے۔ ان کی وجہ سے رنگ میں بھنگ پڑ گیا اور مرزا کے قیام کلکتہ کا زمانہ
ذہنی پریشانیوں اور ادبی مقابلوں میں گزرا۔ آخر کار انھوں نے ایک فارسی مثنوی "باد مخالف"
لکھی جس میں ایک حد تک معذرت اور کچھ ہجو ملیح سے کام لیا۔

کلکتہ کے قیام نے مرزا کو جگہ جگہ کے لوگوں سے ملنے کا اور خاص کر یورپی تہذیب و تمدن
سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ ان کی نظر نہ صرف زندگی بلکہ زبان و ادب کے مسائل میں بھی وسیع
ہو گئی۔ وہ اگرچہ بظاہر اپنی روش پر قایم رہے اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ان کی فطرت کا
اقتضا تھا تاہم ۲۰ نومبر ۱۸۲۹ء کو جب وہ دلی واپس ہوئے تو ان کے کلام اور طبیعت پر اس
میل جول ان ہنگاموں اور مقدمہ میں ناکامی کا ضرور اثر نمودار ہوا۔ ان میں اب وہ مشیخت اور جوانی
کی ترنگ باقی نہ رہی تھی۔

بدنامی

دلی میں بھی غالب کو اب پہلے کی طرح چین نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ ہار کے بعد شمس الدین احمد خاں
سے ان کی مخالفت اور بڑھ گئی اور چونکہ ریزیڈنٹ ولیم فریزر ان کا گہرا دوست تھا
جب وہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو شام کے وقت گولی سے مار دیا گیا تو اس کے قاتلوں کی تلاش میں

نواب شمس الدین احمد خاں کے آدمیوں کا پتہ چلا۔ اس وقت غالب پر کسی دیوانی مقدمہ میں ڈگری ہو چکی تھی اور وہ گرفتاری کے ڈر سے رات کے وقت چھپ کر نکلا کرتے تھے اور اسی طرح شہر کے مجسٹریٹ کے یہاں بھی جاتے تھے جو ان کے ملنے والوں میں سے تھے۔ اس واقعہ اور شمس الدین احمد خاں کی مخالفت اور فریزر کی دوستی اور آخر میں شمس الدین احمد خاں کا ۸ راکتوبر ۱۸۳۵ء کی صبح میں پھانسی پانا' ان سب باتوں کی وجہ سے لوگ غالب پر جاسوسی کا شبہ کرنے لگے تھے۔ اور چونکہ اہل دہلی ایک مسلمان رئیس کی اس ذلت کے ساتھ موت سے بہت رنجیدہ تھے انھوں نے اس کا ایک سبب غالب کو بھی سمجھ لیا اور ان کو بری نظر سے دیکھنے لگے۔ غالب کی زندگی میں ان کی غیر مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

شمس الدین احمد خاں کی وفات اور ان کی ریاست فیروز پور جھرکہ کی ضبطی کے بعد مرزا غالب کی پنشن دہلی کلکٹری سے ملنے لگی لیکن اس میں اضافہ نہ ہو سکا اور مرزا ہر طرح کی کوششوں کے بعد مایوس ہو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

قید مرزا کو بچپن سے شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی اور شغل کے طور پر کچھ بازی بدکر کھیلتے تھے۔ اور یہ خلاف قانون تھا اس لئے جون ۱۸۴۷ء میں قماربازی کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے اور چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا فیصلہ سنا۔ لیکن پورے چھ ماہ قید میں نہ رہے۔ تین ماہ کے بعد مجسٹریٹ کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے۔

اس واقعہ کے متعلق محسن بن شبیر صاحب بی۔ اے ال ال بی نے ایک مختصر سی کتاب "یوسف ہندی قید فرنگ میں" لکھی ہے جو ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

اس میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی مکمل درج ہے جو انھوں نے قید خانہ میں لکھا تھا اور جس کے ایک ایک لفظ سے غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔

قلعہ کی ملازمت

چونکہ مرزا غالب انگریزوں کے پنشن خوار تھے اور اس سلسلہ میں انگریز عہدہ داروں سے انھیں تعلقات رکھنے پڑے تھے اس لئے قلعہ سے ان کا تعلق نہ ہو سکا۔ لیکن جب انگریزوں نے بادشاہ پر زور ڈال کر اپنے آدمی حکیم احسن اللہ خاں کو مدار المہامی کی خدمت پر مامور کرا دیا تو انگریزوں کے دوسرے بہی خواہوں کو بھی دربار مغلیہ میں باریابی کا موقع مل گیا۔ اور مرزا غالب بھی وزیر کی عنایت سے ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور پچاس روپیہ ماہوار سے سرفراز کئے گئے۔ اور یہ ملازمت اور اعزاز بھی شاعر کی حیثیت سے نہیں ملا۔ لیکن کچھ نہ کچھ کام ان کے تفویض کرنا ضرور تھا اس لئے وزیر نے تاریخ تیموریہ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔

غالب کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وزیر ان کو پورا مواد جمع کر دیتے تھے اور یہ اس کو اپنی طرز خاص میں قلمبند کر دیتے تھے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی مرزا جدتیں اور خاص رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تاریخ "پرتوستان" کا ایک بالکل نیا اسلوب ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے دو حصوں پر منقسم کر دیا تھا۔ ایک مہر نیمروز دوسرا ماہ نیم ماہ۔ لیکن فقط پہلا حصہ تکمیل کو پہنچا۔ دوسرا نام ہی نام ہے۔ کام کا آغاز بھی نہ کرنے پائے تھے کہ غدر ہو گیا۔

عروج و زوال

۱۶ر نومبر ۱۸۵۴ء کو جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے

اپنا کلام مرزا کو دکھانا شروع کیا۔ بادشاہ کے علاوہ ولی عہد اور دیگر شہزادے بھی غالب کے شاگرد ہوئے۔ اب جو مرزا کی قدر و منزلت اور مالی حالت بھی اچھی ہونے لگی تھی کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر کا آغاز ہوا اور مرزا خانہ نشین ہو گئے۔ اس تنہائی اور پریشانی کے عالم میں انھوں نے کتاب "دستنبو" میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے اور ایک فارسی لغت برہان قاطع کی غلطیاں قلمبند کیں۔ اس اثناء میں ان کے بھائی مرزا یوسف نے ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا، وہ جوانی ہی میں دیوانے ہو گئے تھے اور مرزا کے لئے ان کا وجود و عدم برابر تھا۔ غدر کے ساتھ ہی مرزا کی پنشن اور قلعہ کی تنخواہ بند ہو گئی۔ ان کی بیوی کے زیورات اور قیمتی کپڑے جو میاں کالے کے مکان میں حفاظت کے لئے بھیج دئیے گئے تھے لٹ گئے۔ مسلمان اعزہ و اقارب سب پریشان تھے کہیں سے کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔ البتہ ان کے ہندو احباب مہیش داس، ہرگوپال تفتہ اور منشی ہیرا سنگھ وغیرہ نے حتی الوسع ان کی مدد کی۔

رامپور سے تعلق

غدر سے چند ماہ قبل ہی سے مرزا کا تعلق رامپور سے ہو گیا تھا اور نواب یوسف علی خاں جو بچپن میں قیام دہلی کے زمانہ میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے اب ان سے اصلاح سخن لینے لگے تھے اور کبھی کبھی کچھ رقم بھی بھیجا کرتے تھے۔ لیکن مسلسل تین سال یعنی مئی ۱۸۶۰ء تک ان کی انگریزی پنشن بند رہی اور وہ گھر کے برتن اور کپڑے تک بیچ کر کھاتے رہے۔ آخر کار وہ گھر بار چھوڑ کر کسی طرف نکل جانا چاہتے تھے کہ ۱۶ جولائی ۱۸۵۹ء سے نواب رامپور نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ ان کے نام جاری کر دی جو ان کی وفات تک ملتی رہی۔

انگریزوں کی خفگی

غالب جو انگریزوں کے موروثی پنشن خوار تھے عمر بھر انگریزوں کی مدح سرائی اور خیر سگالی کرتے رہے لیکن غدر کے زمانہ میں انگریزوں کو ہندوستانیوں سے ایسا تلخ تجربہ ہوا تھا کہ وہ اپنے اچھے سے اچھے بہی خواہوں پر شبہ کرنے لگے تھے چنانچہ مرزا پر بھی کئی الزامات لگائے گئے جن میں اہم الزام یہ تھا کہ انھوں نے ۱۰ر جولائی ۱۸۵۷ء کے دربار شاہی میں بہادر شاہ کے نام کا سکہ لکھ کر پیش کیا تھا۔

جب حکومت کی اس بدظنی کو دور کرنے کی جملہ تدبیریں ناکام ہوئیں تو مرزا نے دربار رام پور کے ذریعہ سے اپنی صفائی کی ترکیب سوچی اور یوں بھی نواب نے رامپور آنے کی تین بار دعوت دی تھی اس لئے ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے نکل کر ۲۷ر جنوری کو رام پور پہنچے اور قریب تین مہینے قیام کر کے ۱۷ر مارچ کو رامپور سے نکلے اور ۲۴ر مارچ کو دہلی واپس آگئے۔ اسی مہینے سے ان کی پنشن پھر جاری ہو گئی اور ان کا سفر رامپور ہر طرح کامیاب رہا۔ پنشن کے علاوہ تین سال بعد مارچ ۱۸۶۳ء سے دربار و خلعت کا اعزاز بھی بحال ہو گیا۔

رامپور کا دوسرا سفر

جب ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے فرزند کلب علی خاں جانشیں ہوئے تو تہنیت کے لئے مرزا غالب نے رام پور کا سفر کیا۔ اس دوسرے سفر میں صرف دو ماہ قیام رہا یعنے ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رامپور پہنچے اور ۸ر دسمبر کو دلی کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں دریائے رام گڈھ کی طغیانی اور پل بہہ جانے کی وجہ سے ان کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اور یہ دسمبر کی سردی اور بارش کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔

وفات

اس حادثہ کی وجہ سے ان کی کمزوری میں اضافہ ہو گیا اور طرح طرح کی بیماریوں نے

گھیر لیا۔ آخر کار عرصہ تک علیل رہنے کے بعد ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو پیر کے دن آٹھ بجے صبح انتقال کیا اور سلطان جی میں اپنی سسرالی خاندان لوہارو کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

اخلاق و عادات

غالب کی زندگی کے واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق و عادات کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے تاکہ ان کی زندگی کا یہ پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

مرزا غالب کے سوانح حیات، ان کی تصنیفات اور خاص کر ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی نسبت بعض بدگمانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مولوی حالی نے "یادگار غالب" میں ان کے معائب کی مدافعت کی جگہ جگہ ناکام سی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا پہلو ہے جو کسی نہ کسی طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے اور اس قسم کی باتوں کی پردہ پوشی کرنا انسان کو فرشتہ ثابت کرنا ہے۔ اس لئے مناسب تو یہ ہے کہ اُن اسباب و علل اور نفسیاتی واقعات کو پیش کر دیا جائے جنھوں نے غالب کی طبیعت اور اخلاق و عادات کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔

مرزا غالب کی آزادہ روی، رندمشربی، اسراف اور اس کی وجہ سے ہمیشہ قرضہ میں مبتلا رہنا ایسے واقعات ہیں جو اس زمانہ کے امیرزادوں کی طرز معاشرت کا لازمی نتیجے تھے۔ مرزا ایک متمول اور خوشحال گھر میں پیدا ہوئے تھے، کوئی سرپرست اور نگراں نہ تھا۔ ان کے ننھیال کی شہر آگرہ میں کافی املاک اور بڑی بڑی ڈیوڑھیاں تھیں جن میں وہ پتنگ اُڑانے شطرنج اور چوسر کھیلنے اور طرح طرح کے لہو و لعب میں مشغول رہتے تھے اور بہت ممکن ہے کہ رندمشربی اور شاہد بازی کا چسکہ بھی وہیں لگا ہو۔ بعد کو جو مرزا قماربازی کے جرم میں گرفتار ہو کر قید ہوئے

وہ بچپن اور عنفوان شباب کی انہی رنگ رلیوں کا ثمرہ تھا۔

اس کو محض اتفاق سمجھئے یا دہلی میں آمد اور الٰہی بخش خاں معروف کے خاندان میں نسبت ہونے کا نتیجہ کہ انھوں نے رفتہ رفتہ بہت سی خراب عادتوں کو ترک کر دیا اور صرف شعر گوئی اور رندمشربی کو آخر عمر تک جاری رکھا۔ اور اس میں بھی ہمیشہ اعتدال سے کام لیا جسکی وجہ سے وہ عمر طبعی تک پہنچ سکے۔ ان کی بیوی نہایت متقی اور عبادت گزار تھیں اور انھوں نے اپنے خاوند کی شراب نوشی کو موقوف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہوگی لیکن جب دیکھا کہ اس کافر کا چھٹنا مشکل ہے تو خود اپنا کھانا پینا اور برتن علیحدہ کر لئے۔ ان کے خسر نواب معروف نے بھی مرزا کو اچھے کاموں میں مصروف رکھنے کی ممکنہ سعی کی اور اپنے مریدوں کے لئے شجرہ خلافت و سلسلہ بیعت نقل کرنے کا کام ان کے سپرد کر کے دیکھ لیا کہ مرزا نے کس خوبی سے ایک ایک نام درمیان میں چھوڑ کر شجرہ نقل کیا اور کام سے بچ گئے۔ ان شوخیوں اور بے پروائیوں کے باوجود دلی کے قیام اور وہاں کی صحبتوں کا مرزا پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ایک خوش ذوق شاعر و ادیب اور ظریف الطبع امیرزادہ کی حیثیت سے شائستہ اور اہل ذوق اصحاب کی محفلوں میں بار پانے لگے۔

اس کے بعد جب پنشن کے جھگڑوں نے پریشان کر دیا اور ساتھ ہی کلکتہ میں علمی و ادبی مقابلے اور مباحثے ہوئے تو مرزا کی جوانی کی ترنگیں اور بچپن کی آزادہ روی پھر عود کر آئی۔ وہ درشت لہجے، بے باک تقریر و تحریر اور تیز مزاجی سے کام لینے لگے جس کی وجہ سے ان کی مخالفتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اور مخالفین کے ساتھ ساتھ مرزا کی ذہنی تکلیفیں اور تیز مزاجی بھی ترقی

کرتی گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے برہان قاطع پر تنقید لکھی تو اس کا اسلوب آتنا درشت ہوگیا اور بعض عبارتیں ایسی تلخ لکھیں کہ قدامت پسند طبیعتوں کو ناگوار گزرا اور انھوں نے ان کو غیر شائستہ قرار دے کر مرزا پر سب وشتم شروع کیا اور بعض مخالفین نے ان کے جواب میں گالی گلوچ سے بھی کام لیا جن کی وجہ سے مرزا اڑے چراغ پا ہوئے اور تنگ آکر اپنے مخالفین پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ بھی دائر کر دیا۔ مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی جو ان کی ترش روئی اور تند مزاجی میں اور بھی اضافہ کا باعث تھی۔

ان علمی و ادبی اور عدالتی مخالفتوں کے علاوہ افلاس و عسرت نے بھی مرزا کو ہمیشہ پریشان حال اور مضطرب رکھا۔ ان کو بچپن سے اسراف اور قرض لینے کی عادت سی ہوگئی تھی جس کی بنا پر وہ اپنے گھر کا پورا اثاثہ یہاں تک کہ بیوی کے قیمتی کپڑے اور زیور بھی بیچ کر کھانے پر مجبور ہوگئے تھے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پریشان کن بات ان کی پنشن کی مسدودی تھی جس میں اضافہ کی خاطر وہ اپنی جوانی کے بہترین ایام مقدمہ بازی اور کچہریوں میں صرف کر چکے تھے اور جس کے غدر کے بعد سے بند ہو جانے کی وجہ سے ضعیف العمری میں مرزا کو سعی، سفارش اور خوشامد بلکہ دریوزہ گری تک کے لئے مجبور ہو جانا پڑا۔

مرزا کی طبعی خودداری، آزادہ روی اور رندمزاجی کے باوجود ان کے کلام میں امیروں اور عہدہ داروں کی جو مدح سرائی اور ان کے بعض خطوط میں جو سوقیانہ خوشامد، حرص و ہوس اور حسن طلب نظر سے گزرتا ہے اس کا اصل سبب ان کی یہی غیر معمولی عسرت اور ضرورت سے زیادہ اخراجات تھے، اگر ان کی پنشن غدر کے زمانہ میں بند نہ ہو جاتی تو مرزا کی شاعری اور

خطوط کا آج اور ہی ڈھنگ ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی پراگندہ روزی نے ان کو ہمیشہ پراگندہ دل رکھا اور ان کو ان کی طبیعت کے خلاف نوابوں اور انگریز عہدہ داروں کی خوشامد کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر ان کے خطوط اور ذخیرۂ کلام میں توقع سے زیادہ مدح سرائی کا حصہ شامل نہ ہوتا تو آج غالب کی شخصیت کچھ اور ہی نظر آتی۔

ان مصائب کے باوجود جو زیادہ تر مجبوریوں کا نتیجہ تھے مرزا کی طبیعت میں ایسی خوبیاں بھی موجود تھیں جو ان کے جیسے بڑے آدمیوں میں ہونی ضروری تھیں۔ ان میں مروت اور فراخ حوصلگی حد سے زیادہ پائی جاتی تھی اور اس کی وجہ سے انھیں تکلیفیں بھی اٹھانی ہوتیں مگر وہ طبیعت سے مجبور تھے اور اکثر ہر ایک کے ساتھ سلوک کرنے کی طرف مائل رہتے خواہ ان کے یہاں کچھ ہو یا نہ ہو۔

مذہبی رواداری ان کے صوفیانہ عقائد کا نتیجہ تھی اس کے علاوہ ہندو و مسلمان اور سنی و شیعہ ہر مذہب و ملت کے احباب اور تلامذہ اس کثرت سے ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے کہ ان کے لئے ایک دوسرے میں امتیاز کرنا دشوار تھا۔ چونکہ خود عمر بھر کسی مذہب کے مطابق کوئی عبادت نہیں کی اور نہ کوئی مذہبی عصبیت تھی اس لئے ہر مذہب والا ان سے بے تکلف ملتا اور اپنے مطلب کی بات لکھا لیتا۔ چنانچہ انھوں نے مولوی فضل حق خیرآبادی کی خاطر وہابیوں کے خلاف لکھ دیا اور حکیم احسن اللہ خاں کی خاطر شیعوں کے خلاف۔ اور جب کسی نے کچھ پوچھا تو صاف کہہ دیا کہ مطلب ان کا ہے الفاظ میرے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی ہے۔ انھوں نے اس شعر میں اپنے کیش کا بالکل سچا اعتراف کیا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مذہب سے اس بے تعلقی اور بے پروائی کے علاوہ اتنا ضرور ہے کہ وہ وحدۃ الوجود اور حبِ اہل بیتِ نبیؐ کا اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بعض احباب نے شیعہ طریقہ پر ان کے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہی لیکن ان کے برادرِ نسبتی اور عزیز دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں نے سنی طریقہ پر تجہیز و تکفین کرنے پر زور دیا۔

فراخ حوصلگی اور مذہبی رواداری کے علاوہ جو چیز ان کے اخلاق و عادات کا سب سے بڑا جزو تھی وہ ان کی ظرافت ہے۔ مولوی حالی نے متعدد لطیفے لکھنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ ان کو "حیوانِ ناطق کی جگہ حیوانِ ظریف کہنا زیادہ مناسب ہے" وہ بات میں بات پیدا کرنے اور زندگی اور اس کے مرحلوں کو شگفتہ اور مزاحیہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی سے ہو گئے تھے۔ ہنسنا اور ہنسانا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنی گفتگو یا خطوط کے ذریعہ سے خوش کرنا ان کا ایک خوشگوار فریضہ بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے ملنے یا ان کا خط دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ ان کی طبیعت کی یہ شوخی و ظرافت ان کے عہدِ طفولیت کی رنگ رلیوں اور آزادہ روی سے پیدا ہوئی تھی لیکن تعجب ہے کہ زندگی کے بکھیڑوں اور معاش کے جھگڑوں کے باوجود باقی رہی اور آخر عمر میں تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اور مرزا بیچائے خود ایک انجمن بن گئے تھے۔

غالب کے ادبی کارنامے

فارسی نظم

مرزا نے بچپن سے فارسی میں بھی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور آخر وقت تک تقریباً گیارہ ہزار شعر لکھے۔ جن میں ساڑھے چار ہزار شعر صنف غزل میں اور دو ہزار سے زیادہ صنف مثنوی میں ہیں۔ باقی قصائد و قطعات اور ترکیب بند و ترجیع بند ہیں۔ انھوں نے کل "تینتیس" فارسی قصیدے لکھے جن میں بارہ حمد و نعت و منقبت و مدح ائمہ میں اور باقی بیس اکیس قصائد شاہان دہلی و اودھ نوابان رامپور اور انگریز عہدہ داروں اور اپنے دوستوں اور محسنوں کی تعریف میں ہیں۔ اصل میں ان کا کمال سخنوری ان قصیدوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

قصیدوں کے بعد مثنویوں کا درجہ ہے جو کل گیارہ ہیں۔ جن میں "چراغ دیر"۔ "باد مخالف" اور "ابر گہر بار" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غزلیں زیادہ تر مرزا بیدل کی تقلید میں لکھی گئی ہیں اور انکی طبیعت کا خاص رنگ، جو اردو غزلوں میں نمایاں ہے فارسی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

(مجموعے)

کلیات تیس بتیس سال کی عمر تک مرزا کے فارسی کلام کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا جس کو ۱۸۳۵ء میں انھوں نے "میخانۂ آرزو" کے عنوان سے مرتب بھی کر لیا تھا۔ مگر یہ کلیات نظم دس سال تک شائع نہ ہو سکا۔ آخر کار نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد

۱۸۴۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد جو کلام جمع ہوا وہ غدر میں لٹ گیا۔ اور پھر منشی نولکشور نے نیر کے فرزند شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے بقیہ کلام وصول کر کے "کلیات نظم فارسی" کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شایع کیا۔

ابر گہربار غالب کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے جس میں گیارہ سو سے زائد شعر ہیں۔ مرزا کا ارادہ تھا کہ "شاہ نامہ فردوسی" کے رنگ میں غزوات نبوی کو منظوم کیا جائے لیکن صرف تمہیدی حصہ یعنے حمد و نعت و منقبت و عرض حال وغیرہ لکھ سکے تھے کہ خیال چھوڑ دیا۔ کام بہت اہم اور اطمینان طلب تھا۔ اور آرام و اطمینان مرزا کو عمر بھر نصیب نہ ہوا۔ بہرحال یہ نامتمام مثنوی کلیات میں شامل کر دی گئی تھی۔ مگر حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر مرزا نے اس کو علحدہ شایع کرنے کی اجازت دیدی کیونکہ اس میں آنحضرت صلعم کے معراج مبارک کا قصہ اس خوبی او شرح و بسط کے ساتھ منظوم ہوگیا تھا کہ یہ بجائے خود ایک مستقل کتاب ہوگئی۔ در اصل یہی موضوع بحالت موجودہ اس مثنوی کا ماحصل ہے۔ چنانچہ یہ ۱۲۸۰ء میں اکمل المطابع سے شایع ہوئی اس کے ساتھ چند رباعیاں دو قطعے اور دو قصیدے بھی شامل کر دئیے گئے جو کلیات میں شایع نہ ہو سکے تھے یا اس کے بعد لکھے گئے تھے۔ قصیدوں میں پہلا لارڈ الگن کی اور دوسرا لارڈ لارنس کی مدح میں ہے۔

سبد چین کلیات کی طباعت کے بعد مرزا نے جو قصائد و قطعات اور دوسرا کلام لکھا تھا (جس میں کچھ "ابر گہربار" کے ساتھ بھی شایع ہوا تھا) اس کو اس عنوان سے اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی نے شایع کیا۔ بعد کو یہ مختصر مجموعہ نایاب ہو چکا تھا۔ ابھی ابھی

۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ نے جید برقی پریس دہلی سے اس کو دوبارہ چھپوا کر شایع کیا ہے۔
اور اس دوسرے ایڈیشن میں غالب کا جو اور کلام منتشر تھا اس کو بھی شریک کر دیا گیا
ہے۔ اس مجموعہ میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں بھی ہے۔

فارسی نثر

مرزا جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی فارسی انشا پردازی عنفوان شباب سے شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر اٹھائیس سال کی تھی اور بعد میں چالیس سال تک جاری رہی۔ آخر کار درفش کاویانی کی اشاعت اور اردو خطوط نویسی کے آغاز کے بعد مرزا نے فارسی میں لکھنا ترک کر دیا۔

پنج آہنگ یہ مرزا کی پہلی تصنیف ہے۔ ۱۸۲۵ء میں جب انگریزوں نے بھرت پور پر چڑھائی کی تو مرزا غالب کے چچا خسر نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ انگریزوں کی طرف سے فوج میں شامل تھے اور ان کے ہم رکاب مرزا غالب اور ان کے حقیقی سالے علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ اس وقت رنجور نے مرزا سے فرمایش کی کہ آپ کوئی ایسی کتاب لکھ دیں جس کے مطالعہ سے القاب و آداب اور خطوط نویسی کے لوازم سے آگاہی ہو۔ چنانچہ مرزا نے پہلے اس کتاب کے ابتدائی دو حصے لکھے اور آخر کار پانچ حصے لکھ کر اس کا نام پنج آہنگ رکھا۔ ہر حصہ کی تفصیل یہ ہے:—

آہنگ اول۔ القاب و آداب اور ان کے متعلقہ مراتب۔ آہنگ دوم۔ مصادر و مصطلحات و لغات فارسی۔ آہنگ سوم۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان غالب۔ آہنگ چہارم۔ کتابوں کے خطبے۔ تقریظیں، اور متفرق عبارتیں۔ آہنگ پنجم مکاتیب۔

لیکن یہ ان کے فارسی خطوط اور منتشر تحریروں کا مکمل مجموعہ نہیں ہے کیونکہ غدر میں ان کی جو تحریریں نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حسین مرزا کے کتب خانوں سے ضایع ہوئیں ان کے علاوہ بعض اور خطوط اور تحریریں وغیرہ اس میں شامل نہیں ہیں۔

یہ کتاب دو دفعہ علیحدہ چھپی۔ ایک دفعہ منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ میں اور ایک دفعہ مطبع سلطانی میں۔ مطبع سلطانی کے نسخہ کی تاریخ طباعت ۴ اگست ۱۸۴۹ء ہے۔ ان طباعتوں کے علاوہ پنج آہنگ مرزا کی کلیات نثر میں بھی شامل ہے جو اب تک کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

مہر نیم روز جب انگریزوں کی کوشش اور اثر سے حکیم احسن اللہ خاں احترام الدولہ احترام الملک حاذق جنگ بہادر شاہ کے وزیر مقرر ہوئے تو انھوں نے دربار میں انگریزوں کے اور بہی خواہوں کے لئے بھی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہی میں ایک مرزا غالب تھے جو انگریزوں کے پنشن خوار اور حکام انگریزی کی دوستی کی وجہ سے انگریزوں کے بہی خواہوں میں شمار کئے جاتے تھے اور اس وقت تک دربار میں جگہ نہ پا سکے تھے۔ اب حکیم صاحب نے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ غالب جیسا ادیب اور شاعر دلی شہر میں موجود ہو اور شاہی دربار کا متوسل نہ ہو تو تعجب کی بات ہے۔ اس پر بادشاہ نے مرزا کو باریاب کر کے شاہی مورخ کی حیثیت سے ملازم کیا لیکن مرزا کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور انھوں نے غالباً انکار کر دیا جس پر وزیر نے یہ انتظام کیا کہ تاریخی معلومات خود مرتب کر کے دیتے جن کو مرزا اپنے خاص اسلوب میں قلمبند کر لیتے تھے۔ اس طرح ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے تاریخ نگاری کی ملازمت شروع ہوئی جو غدر تک باقی رہی۔

اس تاریخ کا نام انھوں نے "پرتوستان" رکھا اور اس کو دو حصوں پر منقسم کر دیا۔ پہلا حصہ "مہر نیم روز" جس میں آغاز سلطنت سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات لکھے اور دوسرا حصہ "ماہ نیم ماہ" جس میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ تک کے حالات درج کرنا چاہتے تھے لیکن اس حصہ کا صرف نام رہ گیا۔ کتاب کی ابتدا بھی نہ ہو سکی۔

مہر نیم روز دو سال کے اندر ہی یعنی مارچ ۱۸۵۲ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی مگر دو برس تک چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ آخر کار ۱۸۵۵ء میں فخر المطابع میں شایع ہوی۔ بعد کو ۱۹۲۷ء میں اس کا ایک دوسرا ایڈیشن پروفیسر اولاد حسین شاداں نے تصحیح و تحشیہ کے بعد مطبع کریمی لاہور سے شایع کیا۔

دستنبو | غدر کے ساتھ ہی جب قلعہ کا آنا جانا موقوف کر کے مرزا گھر بیٹھ رہے تو بیکاری میں غدر کے حالات قلمبند کرنے شروع کئے۔ جو کچھ لکھتے اس کی ایک نقل میر مہدی مجروح کو بھی بھیج دیتے تھے تاکہ ایک کے یہاں سے تلف ہو جائے تو دوسرے کے یہاں محفوظ رہے مئی ۱۸۵۷ء میں لکھنا شروع کیا اور اگست ۱۸۵۸ء میں ختم کر دیا۔ ممکن ہے اور جاری رکھتے لیکن اس زمانہ میں اندور والے منشی امید سنگھ ان کے یہاں آئے اور دستنبو کا مسودہ دیکھ کر اس کے چھاپنے کا قصد کیا جس پر مرزا نے یکم اگست تک کے حالات لکھ کر کتاب ختم کر دی۔ اور ستمبر میں اس کا مسودہ منشی ہرگوپال تفتہ کے یہاں آگرہ بھیج دیا۔ وہاں منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق نے نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتہ میں اس کو چھاپ کے شایع کیا۔ یہ پورا ایڈیشن پانچ ہی مہینوں میں ختم ہو گیا۔ جب مرزا رام پور میں تھے تو حکومت پنجاب نے ان سے دستنبو کا ایک

نسخہ طلب کیا۔ انھوں نے ایک نسخہ صحیح کر کے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ کے مطبع واقع بریلی بھیجا
چھپنے کو بھیجا۔ جہاں سے ۱۸۶۵ء میں دوسرا اور ۱۸۷۱ء میں تیسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ پہلے ایڈیشن
میں دستنبو کا آغاز اس قصیدہ سے کیا تھا جو ملکہ معظمہ کی مدح میں لکھا تھا لیکن بعد کو اصل نثر پہلے
کر دی اور قصیدہ آخر میں۔ قصیدہ کے ساتھ مرزا نے قطعہ چراغاں بھی شامل کر دیا جو فتح دہلی کی خوشی
میں چراغاں کے موقع پر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔

کلیات نثر ۱۲۸۰ء میں جب منشی نولکشور دہلی آئے تو انھوں نے مرزا سے کلیات نثر چھاپنے
کی اجازت چاہی۔ مرزا نے متذکرہ تین نثر کی کتابوں کو یکجا کر کے شایع کرنے کی
اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے جنوری ۱۸۶۸ء میں اس کو پہلی بار اور ۱۸۷۱ء میں دوسری اور
۱۸۷۷ء میں تیسری بار شایع کیا۔

قاطع برہان غدر کے زمانہ میں دستنبو کے علاوہ مرزا نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع
پر بھی حاشیے لکھنے شروع کئے۔ جب پوری کتاب دیکھ ڈالی تو آخر میں تمام
حاشیوں کو یکجا کر کے قاطع برہان کے عنوان سے علیحدہ لکھوالیا۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء سے قبل مکمل ہو چکی
تھی لیکن چھپنے کے سامان دو سال تک پیدا نہ ہوئے۔ آخر ۱۸۶۲ء میں نواب یوسف علیخاں
کی مدد سے مطبع نولکشور سے شایع ہوئی۔

درفش کاویانی قاطع برہان کی اشاعت سے علمی دنیا میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا
چونکہ مرزا کا لب و لہجہ درشت اور اسلوب سخت تھا اس لئے پرانی طرز کے
لوگ بہت سیخ پا ہوئے اور مرزا کے خلاف کئی رسائل مثلاً ساطع برہان، قاطع القاطع

محرق قاطع، موید برہان، شمشیر تیز تر وغیرہ اور مختلف خطوط شایع ہوئے۔ مرزانے بھی ان کے جواب لکھے اور لکھوائے، تیغ تیز، لطائف غیبی، واقع ہذیان، نامہ غالب، اور سوالات عبدالکریم وغیرہ اسی سلسلہ میں لکھی گئیں۔

اس زمانہ میں مرزا بہت پریشان رہے اور کلکتہ میں ان کے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان ابل پڑا تھا اس وقت اس سے زیادہ سختی اور جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ ان کے یہاں گمنام خطوں میں گالیاں آنے لگیں۔ اور وہ اتنے پریشان ہو گئے کہ اپنے بعض دوستوں سے بھی بدگمانی پیدا کر لی۔

دو تین سال کی مخالفتوں کے بعد جب طوفان کچھ تھما تو مرزا نے مزید مطالب و اعتراضات کا اضافہ کر کے قاطع برہان کو دوسری دفع دسمبر ۱۸۶۵ء میں درفش کاویانی کے نام سے شایع کیا۔ یہ کتاب اکمل المطابع میں شایع ہوی۔ اور اس کے لئے میر غلام بابا خاں رئیس سورت نے ان کو مدد دی تھی۔

اردو نظم

مرزا غالب نے اپنی شاعری کی ابتدا اردو ہی سے کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو ذوق کے مقابلہ میں انھوں نے اردو کلام کو اپنے لیے باعث ننگ ظاہر کیا اور لکھا کہ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا میں غالب نے بیدل کی تقلید کی وجہ سے اپنی شاعری کو چیستاں بنا لیا تھا اور خود ہی اس کا اعتراف بھی کیا کہ ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

لیکن آخر کار وہ سیدھے راستہ پر آ پڑے اور میر و درد کی طرز میں جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے آج اردو کے ایک بہت بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

مرزا کی شاعرانہ عظمت کے بنانے میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا بڑا حصہ ہے کیوں کہ انھوں نے مرزا کے کلام کا رنگِ سخن بدلا اور ان کے مجموعہ میں سے ایسے اشعار چھانٹ دیئے جو مرزا کی شاعری کو بدنام کر رہے تھے اور جس کو لوگ ؎

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

دیوان کا پہلا ایڈیشن

جیسی شاعری سمجھنے لگے تھے۔ یہ انتخاب پہلی بار ۱۲۵۷ھ م ۱۸۴۲ء میں فخر المطابع دہلی سے شایع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ تھی جو سرسید کی کتاب آثار الصنادید میں موجود ہے۔ اس دیوان میں کل

۷۲۔اشعر تھے یہ ایڈیشن اب تقریباً نایاب ہے۔

دوسرا ایڈیشن

پہلی طباعت کے پندرہ سال بعد یعنے ۱۲۷۱ھ میں دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ اس میں سات سو شعر زیادہ ہیں جملہ تعداد اشعار ۱۷۹۲۔ اس کی ترتیب بھی جدا ہے۔ پہلے مرزا کا فارسی دیباچہ پھر قطعات پھر ایک مثنوی پھر قصیدے، غزلیں اور رباعیاں اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں کی تقریظ۔

۱۲۷۸ھ کے ایڈیشن

غدر کے قبل غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ نواب رامپور کے پاس بھیجا تھا اور جب وہ ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو نیر و رخشاں کی فرمایش پر اس نسخے کی نقل لے کر روانہ کی کیونکہ نیر کا نسخہ غدر میں ضایع ہوگیا تھا۔ اس نسخے کی بنا پر ۱۲۷۸ھ میں مطبع احمدی دہلی سے ایک، اور مطبع نظامی کانپور سے ایک، اس طرح دو ایڈیشن شایع ہوئے۔ ان کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ یعنے غالب کے فارسی دیباچہ کے بعد غزلیات، پھر چار قصیدے (دو حضرت علیؑ کی منقبت میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں)، اس کے بعد مثنوی صفت انبہ، پھر قطعات اور آخر میں رباعیاں۔

غالب کی زندگی میں ان کے اردو کلام کے یہی چار ایڈیشن شایع ہوے۔ ان کے بعد یوں تو دیوان غالب کے بیسیوں ایڈیشن چھپے لیکن بھوپال کا نسخہ حمیدیہ اور غالب نامہ کا تاریخ وار مرتبہ کلام قابل ذکر ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے مطالعہ سے غالب کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بھوپال کے "نسخہ حمیدیہ" کی طرح شاہی کتب خانہ رامپور میں بھی ایک

دیوان غالب موجود ہے جو عنقریب شایع ہونے والا ہے۔ یہ دیوان خود مرزا نے نواب کلب علی خاں کی فرمایش پر ۱۸۶۶ء میں اپنے کلام سے منتخب کرکے تیار کیا تھا۔ اور اس کی اشاعت سے بھی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

باتصویر نسخے

اس سلسلے میں برلن کے چھپے ہوئے نسخوں نیز مرقع چغتائی اور نقش چغتائی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کیونکہ ان نفیس اور پاکیزہ ایڈیشنوں کی اشاعت سے غالب کی عظمت و مقبولیت میں خاص طور پر اضافہ ہوا۔ اور خود اردو زبان کی وقعت بھی لوگوں کی نظروں میں زیادہ ہوگئی۔

اُردو نثر

مرزا غالب فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اسی لئے اردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہ کی سب سے پہلے اردو نثر میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کے خطوط تھے۔ سنہ ۱۲۵ھ سے قبل ہی سے انھوں نے فارسی میں خط لکھنا ترک کرکے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی وجہ مولوی حالی نے "مہر نیم روز" کی تصنیف کی مشغولیت بتائی ہے اور دوسرے سوانح نگاروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ جب سے غالب کی طبیعت میں ایک طرح کی لاپروائی اور سہل انگاری پیدا ہوتی شروع ہوئی اس وقت سے اردو میں لکھنا شروع کیا کیونکہ فارسی میں ذرا تکلف اور آورد سے کام لینا پڑتا تھا اور اردو میں انھوں نے قلم برداشتہ لکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے اردو خطوط میں بے تکلفی، شگفتگی اور لطف پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے متعلق آخر میں لکھا جائے گا کیونکہ یہ مرزا کے آخر زمانہ میں کتاب کی صورت میں جمع ہوئے۔

نامۂ غالب

غالب کو اردو نثر میں لکھنے کی اصل ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ان کی فارسی کتاب "قاطع برہان" کی تردید اور حمایت میں متعدد کتابیں فارسی اور اردو میں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ جب امام بخش صہبائی کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے "ساطع برہان" (سنہ ۱۲۸۲ھ میں) شایع کی تو مرزا غالب نے اس کے جواب میں "نامۂ غالب" لکھا۔ یہ ۱۶ صفحات کا ایک اردو رسالہ ہے جس کے تین سو نسخے غالب نے اپنے صرفہ سے چھپوا کر دوستوں

تقسیم کر دئے ۔ یہ مطبع محمدی دہلی میں اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا اور اب یہ "عود ہندی" میں شامل ہے ۔

لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم

قاطع برہان کی مخالفت میں ایک اور کتاب "محرق قاطع" بھی لکھی گئی تھی جس کے مصنف سید سعادت علی تھے اور جو مطبع دلہائی شاہدرہ میں ۱۸۶۴ء میں چھپی تھی ۔ اس کے جواب میں مرزا نے خود دو کتابیں "لطائف غیبی" اور "سوالات عبدالکریم" لکھیں اور ان دونوں کو اپنے دوستوں کے نام سے چھپوایا ۔ اول الذکر ۴۸ صفحوں کا رسالہ ہے جس میں مرزا نے اپنے مخالفین کے جواب دئے ہیں اور اپنے ایک معتقد سیف الحق میاں داد خاں سیاح کا نام بطور مولف کے لکھ دیا ہے ۔ یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی ۔ "سوالات عبدالکریم" آٹھ صفحوں کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں غالب نے عبدالکریم کے نام سے کل سترہ سوال لکھے ہیں ۔ یہ اکمل المطابع دہلی میں ۱۲۸۱ھ میں چھپا ۔

تیغ تیز

"ساطع برہان" اور "محرق قاطع" کے علاوہ مرزا غالب کی "قاطع برہان" کی مخالفت میں اور دو کتابیں "قاطع القاطع" اور "موید برہان" بھی لکھی گئیں جن کے جواب میں مرزا نے ایک اردو کتاب "تیغ تیز" لکھی ۔ اس میں سترہ فصلیں ہیں ۔ پہلی سولہ فصلوں میں مولوی احمد علی مولف "موید برہان" پر سولہ اعتراض کئے ہیں ۔ اور آخری فصل میں "برہان قاطع" پر مزید اعتراضات لکھے ہیں ۔ آخر میں سولہ ادبی سوالوں کا استفتا اور ان کے جواب اور جوابوں کی تصدیق و تائید درج ہے ۔ جواب نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے لکھا تھا اور مولوی حالی ، مولوی سعادت علی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ان کی تصدیق و تائید لکھی تھی ۔ یہ رسالہ

۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع میں چھپا۔

نکاتِ غالب اس سال فروری کے مہینے میں مرزا غالب کا ایک اور اردو رسالہ "نکاتِ غالب" بھی شایع ہوا۔ اس میں فارسی زبان کے قواعد لکھے ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں اپنے ۱۵ فارسی مکتوبات درج کئے ہیں اور اس کا نام "رقعات غالب" رکھا۔ یہ دونوں رسالے صرف ۳۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اور ان کی وجہ تصنیف یہ ہوی کہ مرزا کے ایک ہندو معتقد رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب پنجاب کے ناظم محکمہ تعلیمات میجر فلر کی دعوت پر لاہور گئے تھے تاکہ علوم مشرقیہ کی ترقی میں میجر فلر کو مدد دیں۔ میجر نے ان کو حکم دیا کہ مرزا غالب سے بھی کوئی کتاب لکھوانی چاہئے جس کی بنا پر انھوں نے مرزا سے درخواست کی اور کامیاب ہوئے۔ یہ کتاب محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی سے ۱۸۶۷ء میں شایع ہوئی اور اب کم یاب ہے۔

قادر نامہ زین العابدین خاں عارف کے دونوں بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مرزا غالب ہی کے زیر پرورش تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے مرزا نے خالق باری اور آمدنامہ کی طرز پر ۱۳۷ شعروں میں اردو اور فارسی لغات کو منظوم کیا ہے۔ درمیان میں دو غزلیں اور آخر میں چار شعر کا ایک قطعہ بھی شامل ہے۔ یہ آٹھ صفحوں کا مختصر سا رسالہ پہلی بار اکتوبر ۱۸۷۳ء کو مطبع منشی بہاری لال لاہور سے شایع ہوا اور اس کے بعد "قادر نامہ" کے اور متعدد ایڈیشن بھی چھپے۔

عود ہندی غالب نے اپنی وفات سے تقریباً بیس سال قبل ہی سے اردو میں خط لکھنے شروع کر دیئے تھے اور ان کے خطوط کی شگفتگی اور لطف نے ان کے احباب میں خاص شہرت حاصل

کرلی تھی لیکن ان سب کو جمع کرکے شایع کرنے کا خیال ان کی وفات سے صرف سات سال قبل پیدا ہوا۔ ابتدا میں غالب راضی نہ ہوئے اور منشی شیو نراین کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔" آخر کار ممتاز علی میرٹھی نے سب سے پہلے عملی قدم اٹھایا اور چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم و شاہ عالم صاحبان کے نام کے ۱۳۱ خطوط ۱۸۶۱ء ہی میں جمع کر لئے جن پر سرور نے ایک دیباچہ اور قطعۂ تاریخ بھی لکھ دیا لیکن بعد کو ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ بعض دیگر حضرات کے خطوط بھی جمع کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کی مدد سے ۱۳۷ خطوط اور جمع کئے۔ ان کے علاوہ تقریظیں اور نثر کے دوسرے نمونے بھی حاصل کر لئے۔ اس طرح پانچ سال میں مسودہ مکمل کرکے "عود ہندی" نام رکھا اور ۱۸۶۶ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ کو بغرض طباعت دے دیا لیکن اس کو چھپتے چھپتے دو سال لگ گئے اور آخر کار یہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو اس وقت شایع ہوا جب مرزا غالب دنیا میں اور صرف چار ماہ کے لئے موجود تھے۔

اردوئے معلیٰ ممتاز علی خاں کی تحریک کا جب غالب کے دوستوں اور شاگردوں کو علم ہوا تو وہ اُن کے خطوط کے مجموعہ کی اشاعت کے لئے چشم براہ ہو گئے اور مرزا پر اسکی اشاعت کا تقاضا شروع کیا۔ مرزا آخر تنگ آ گئے اور اپنی طرف سے بھی اپنے مرسلہ خطوط کے واپس ملنے کی کوشش شروع کی۔ ممتاز علی خاں کی تعویق سے ان کو شبہ ہوا کہ شاید اب وہ نہ چھاپیں گے چنانچہ انھوں نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا کہ:-

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کئے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ

وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"

اس سلسلے میں مرزا کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے ساتھ مل کر مرزا کے خطوط جمع کرنے شروع کیے۔ لیکن مرزا کی یہ خواہش ان کے جیتے جی پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ مجموعہ "اردوئے معلیٰ" ان کی وفات کے بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں شایع ہوا۔

غالب کے بعد خطوط غالب کے ان دو مجموعوں کی اشاعت کے بعد ان کے متعدد خطوط اور شایع ہوئے ہیں جو رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کئی خط چھاپے اور ان کے متعلق تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صدیقی اور پنڈت کیفی پرشاد یہ دونوں صاحبین مرزا غالب کی تصنیفات کے متعلق اچھی بصیرت رکھتے ہیں اور اس موضوع پر ان کے محققانہ مضامین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ موخر الذکر نے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ ان کی اشاعت کے بعد غالب اور ان کے کارناموں کے متعلق ہماری معلومات میں اور بھی اضافہ ہوگا۔

مکاتیب غالب مرزا کے بعد جب ان کے غیر مطبوعہ کلام اور تحریروں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو جہاں بھوپال کے کتب خانہ سے دیوان غالب کا "نسخۂ حمیدیہ" شایع ہوا، رامپور کے کتب خانہ سے "مکاتیب غالب" بھی خاص اہتمام اور نفاست

کے ساتھ شایع کئے گئے۔ دربار رامپور سے مرزا کی خط و کتابت بارہ برس (جنوری ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۶۹ء) تک جاری رہی۔ یعنے آٹھ سال نواب یوسف علی خاں کے ساتھ اور چار سال نواب کلب علی خاں کے ساتھ۔ یہ تمام خطوط ریاست کے دارالانشاء میں محفوظ تھے اور ان کو ۱۹۳۶ء کے آغاز میں امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانۂ رامپور نے نہایت اہتمام سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کل ۱۱۵ خطوط ہیں۔ اور حاشیہ پر ان خطوط کی نقلیں بھی چھاپ دی گئی ہیں جو ریاست کی طرف سے مرزا کے مکاتیب کے جواب میں بھیجے گئے تھے۔ ان سے غالب کی زندگی، تعلقات اور دیگر حالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

غالب کے اعزّہ واحباب

اعـزہ

بیوی اور اولاد

مرزا غالب کی بیوی دلی کے ایک شریف اور رئیس خاندان کی حلیم الطبع اور متقی و پرہیز گار خاتون تھیں جن کے والد الٰہی بخش خاں معروف ایک صاحب ذوق اور علم دوست امیر تھے۔ وہ پاکیزہ شاعر اور خانہ نشیں صوفی تھے۔ اور شاعروں اور اپنے معتقدوں کی ہمیشہ امداد کرتے رہتے تھے۔ ان کی ۲ لڑکیاں بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم اور ۲ فرزند علی بخش خاں رنجور اور علی نواز خاں تھے۔ چھوٹی دختر امراؤ بیگم کی شادی نہایت کمسنی میں مرزا غالب سے ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو ہوئی۔ انھوں نے اپنے رنگین مزاج شوہر کے عادات و اطوار کی اصلاح میں بہت کچھ حصہ لیا اور زمانۂ فلاکت میں اپنے پریشاں حال خاوند کا ہر طرح سے ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنے زیور اور کپڑے بھی فروخت کے لئے دے ڈالے۔ انھوں نے خود بھی تمام عمر اپنے شوہر کی طرح افلاس میں گذاری اور خاص کر جب مرزا نے مقروض انتقال کیا تو ان کے بعد ان کے قرضوں کی ادائی اور اپنی زندگی کو عزت سے گزارنے میں بے حد زحمت اٹھائی۔ آخر کار مرزا کے بعد ایک سال کے اندر اندر انھوں نے بھی ۴ فروری ۱۸۷۰ء کو مرزا کی برسی کے روز ہی انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر ستّر سال کے قریب ہوگی۔

مرزا کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ کچھ زیادہ شگفتہ نہ تھے۔ دونوں کی طبیعتوں میں بلا کا اختلاف تھا۔ انشاء کا مصرعہ کہ ع ہیں ہوں منھ سوڑ تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں۔ ان دونوں پر پوری

طرح منطبق ہوتا ہے۔ مرزا ظریف الطبع، رند مشرب، یار باش اور جدت پسند تھے تو اُن کی بیوی متقی، پرہیزگار، پابند صوم و صلوٰۃ اور قدامت پسند تھیں۔ دونوں کے کھانے پینے کے برتن علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مرزا اپنی ظریفانہ طبیعت کے اقتضا سے اپنی بیوی کے ساتھ بھی موقع بہ موقع ظرافت و مزاح سے نہیں چوکتے تھے۔ اس سے متعلق ان کے کئی لطیفے مشہور ہیں اور مولوی حالی نے بھی "یادگار غالب" میں نقل کئے ہیں۔

ان کے اگرچہ سات بچے ہوئے مگر کوئی سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ جیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہوگی کہ مرزا اپنی بیوی اور زنانہ مکان کی طرف زیادہ توجہ نہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بیوی کی عبادت گزاری اور تقوے کا خیال بھی پیش نظر ہوگا۔ کیونکہ ایک لطیفہ یہ ہے کہ وہ زنانہ مکان میں اس طرح جوتے اتار کر ادب سے داخل ہوتے جیسے کوئی مسجد یا درگاہ میں جا رہا ہے۔

زین العابدین خاں عارف اور ان کی اولاد

غالب کی سالی بنیادی بیگم غلام حسین خاں مسرور سے بیاہی تھیں جن کے فرزند زین العابدین خاں عارف کو مرزا بہت چاہتے تھے اور ان کی شرافت طبع اور شاعرانہ ذوق کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے عین عالم جوانی میں ۱۸۵۲ء/۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا تو غالب نے وہ پُر درد مرثیہ لکھا جو اُن کے کلام کا سب سے زیادہ موثر نمونہ ہے اور جس کا ایک ایک مصرعہ درد و محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا صرف حسب ذیل مطلع ہی مرزا کے جذبات غم و الم کے اظہار کیلئے کافی ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس مرثیہ کے علاوہ غالب نے عارف کی زندگی ہی میں ان کے متعلق حسب ذیل قطعہ لکھا تھا جس سے غالب کی محبت کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوے عارف نام — کہ زنخش شمع دودمانِ منست
از نشاطِ نگارشش نامش — خامہ رقاص در بنانِ منست
آنکہ در بزم قرب وخلوتِ انس — غمگسارِ مزاج دانِ منست
زورِ بازوے کامرانیِ من — راحتِ روحِ ناتوانِ منست
سود سرمایۂ کمال منی — سخنت گنج شائگانِ منست
اے کہ میراث خوارمن باشی — اندر اُردو کہ آں زبانِ منست
از معانی ز مبدءِ فیاض — یاد آنِ تو ہرچہ آنِ منست

افسوس کہ غالب کی دعائیں بے کار گئیں۔ اور عارف کو اس میراث خواری کا موقع نہ ملا۔

عارف کے دو فرزند تھے باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں۔ باپ کے بعد مرزا اور ان کی بیوی نے ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح پرورش کیا اور ان کے کھیل کود، تعلیم وتربیت، اور بعد کو معیشت وملازمت کے لئے ہر طرح سے کوشش کی۔ باقر علی خاں کی شادی سترہ سال کی عمر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی دختر معظم زمانی بیگم سے کرادی۔ ان کے تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم کی پیدائش کا قطعہ تاریخ بھی غالب نے لکھا تھا جو "سبد چین" میں موجود ہے۔

باقر علی خاں اپنے باپ کے انتقال کے وقت صرف پانچ سال کے تھے۔ اس وقت

غالب کے زیر پرورش رہے۔ بیس سال کی عمر میں مرزا نے ان کو مہاراجہ الور کے یہاں ملازم کرادیا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے باپ کی طرح عین عالم شباب میں ۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا۔

حسین علی خاں ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور عارف کے انتقال کے وقت صرف دو سال کے تھے۔ غالب ان کو بے حد چاہتے تھے اور آخر زمانہ میں ان کی شادی کی فکروں میں تھے کہ انتقال ہوگیا۔ حسین علی خاں نے رامپور میں کچھ دنوں ملازمت کی مگر یہ بھی باپ اور بھائی کی طرح جواں مرگ ثابت ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ضیاء الدین احمد خاں

عارف اور ان کے بچوں کے بعد مرزا کو نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ان کی اولاد سے تعلق خاطر تھا۔ یہ غالب کی بیوی کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے اور اپنے سسرالی عزیزوں میں غالب کو سب سے زیادہ انہی سے محبت تھی یہ غالب کے ارشد تلامذہ میں ہونے کے علاوہ ان کے شفیق دوست اور سچے قدر داں بھی تھے چنانچہ مالی پریشانی کے زمانہ میں مرزا کی بیوی کو پچاس روپئے ماہوار دیا کرتے تھے۔ نیر فارسی میں اور رخشاں اردو میں تخلص کرتے تھے۔ یہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مورخ اور بڑے عالم و فاضل تھے۔ مرزا کے اعزہ میں ان سے بڑھ کر صاحب ذوق، علم پرور، اور سلیقہ مند کوئی نہ تھا۔ غالب نے ان کی تعریف میں ایک فصیح و بلیغ قصیدہ لکھا ہے جس میں ان کی عنایتوں کے اعتراف کے ساتھ اس امر کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ ذوق شعر و سخن میں نیر میرا نمونہ ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

به نکته شیوهٔ شاگرد من به من ماناست　　　صنم بصورت خود می تراشد آذر من

نواب ضیاء الدین خاں نے بڑی تلاش اور محنت سے ایک عظیم الشان کتب خانہ جمع کر لیا تھا مگر افسوس ہے کہ غدر کے ہنگامہ میں وہ بھی تلف ہو گیا۔ انھوں نے غالب کے کلام کی حفاظت اور اشاعت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ مشہور انگریز مورخ الیٹ نے تاریخ ہند کی تالیف میں نیر رخشاں سے کافی استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے سنہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ع میں وفات پائی اور میر مہدی مجروح نے اس مصرعہ میں کہ ع "اب نہ باقی رہی وہ رونق و شان دہلی" ان کی وفات کی بالکل صحیح تاریخ نکالی ہے کیونکہ ان کے بعد دلی کے قدیم علم دوست اور صاحب ذوق بزرگوں کا کوئی نمونہ باقی نہ رہا۔ غالب نے ان کے متعلق بالکل سچ لکھا تھا ؎

بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق   بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ مہتر من

ضیاء الدین احمد خاں کی اولاد میں شہاب الدین ثاقب اور سعید الدین طالب مشہور ہوئے اور ان کی دختر معظم زمانی بیگم زوجہ باقر علی خاں کا ذکر گذر چکا ہے۔ ثاقب کو بھی مرزا بہت چاہتے تھے۔

علاء الدین احمد خاں

علاء الدین احمد خاں علائی بھتیجے تھے نیر رخشاں کے۔ ان کے والد نواب امین الدین احمد خاں لوہارو کے رئیس اور نیر کے بڑے بھائی تھے۔ اور باپ بیٹے دونوں سے غالب کے اچھے تعلقات تھے۔ چونکہ امین الدین احمد خاں اکثر لوہارو میں رہتے تھے اور خاندان میں بڑے تھے اس لئے غالب سے ویسی بے تکلفی نہ تھی جیسی ان کے چھوٹے بھائی نیر اور ان کے فرزند علائی سے تھی۔ لیکن وہ بھی غالب کے قدر دان اور ہمدرد دوست تھے اور ان کی بیوی (جو امین الدین خاں کی چچا زاد بہن تھیں) کی ہر طرح پرداخت

اور مدد کرتے رہتے تھے۔ ان میں اور ان کے فرزند علائی میں جب ۱۸۶۵ء میں کسی سلسلہ میں رنجش ہو گئی تو غالب نے دونوں میں صفائی کرا دینے کی ہر طرح سے کوشش کی چنانچہ ان کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس طرح فرزند سے خوش ہو جانے کے لئے امین الدین احمد خاں کی خوشامد کرتے ہیں اور ان کو شگفتہ رکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔

علاء الدین احمد خاں غالب کے خاص تربیت یافتہ اور منظور نظر تھے۔ عارف کے بعد غالب انہی کو چاہتے تھے۔ اور ۱۸۶۳ء میں فارسی نظم و نثر میں اپنی جانشینی کی ایک سند لکھ دی تھی۔ جس کے چند آخری جملے یہ ہیں:—

"نمی نگری کہ برادر زادۂ نامور روشن دل روشن گہر میرزا علاء الدین خاں تنہا بہ فرمایۂ خرد و نیرداد او در راہِ سخن بہ رہنمائی من رفت۔ و در پیری من و بینائی خویش بہ بزمستانِ سخن گستری جائے من از من گرفت۔ اینک چنانکہ در خویشاوندی و یگانگی مردم چشم جہاں بین منست۔ بر چار بالش ہنرمندی و فرزانگی جانشینِ منست الخ"

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں علاء الدین احمد خاں کو اردو میں بھی اپنا جانشین قرار دیکر ایک اور سند لکھ دی تھی جس کی عبارت یہ ہے:—

اقبال نشان والا شان صدرہ عزیز تر از جان میرزا علاء الدین خاں کو دعائے درویشانہ غالبِ دیوانہ پہنچے۔ سالِ نگارش تم کو یاد ہو گا میں نے دبستانِ فارسی کا تم کو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل لکھ دیا ہے۔

اب جو چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا مہینوں کی
نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں۔ ورنہ دو چار مہینے
پانچ سات ہفتے، دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے اثبات حواس میں اپنی
دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین
چاہئے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے ویسا تم کو جانیں۔ اور جس طرح
مجھ کو مانتے تھے تم کو مانیں۔ کُلُّ شَیٔ ھَالِکٌ اِلّا وَجْھَہٗ وَیَبْقیٰ وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ م ۲۱ جون ۱۸۶۸ء از دہلی۔"

غالب کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی چنانچہ وہ نو ماہ کے اندر ہی ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو فوت ہو گئے اور یہ تحریر اُن کی آخری دستخطی تحریر ثابت ہوئی۔

علاء الدین احمد خاں کے نام متعدد خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی غالب ان کو اور ان کے بچوں کو بہت چاہتے اور اپنا وارث سمجھتے تھے۔ یہ بھی اچھے شاعر اور صاحب ذوق امیر تھے اور اپنے والد کے بعد لوہارو کے رئیس ہوئے تھے۔

غالب کے اعزہ میں یوں تو اور بہت سے مشہور و معروف اصحاب کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں صرف انہی کا تذکرہ کیا گیا جنھوں نے غالب کی زندگی اور کارناموں میں کوئی حصہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ جن اعزہ کے نام غالب کی تحریروں اور خاص کر خطوط میں ملتے ہیں ان سب کے تعلقات ان شجروں سے ظاہر ہوں گے جو یہاں (خاص طور پر تیار کر کے) درج کئے جا رہے ہیں:—

مرزا غالب کے اعزّہ

ترسم خاں
رستم خاں

خواجہ قطب الدین خاں
خواجہ حاجی خاں
شمس الدین خاں خواجہ جان
بدر الدین خاں خواجہ امان

حسام الدولہ
خواجہ غلام حسین خاں کمیدان
عزت النساء = عبد اللہ بیگ خاں
نصر اللہ بیگ خاں
دختر
دختر
دختر
زوجہ مبارک علی بیگ برلاس

موتی بیگم
زوجہ اکبر علی بیگ
کوتوال آگرہ
دفار علی بیگ
نیاز علی بیگ

غالب
مرزا یوسف
عزیز النساء
زوجہ غلام فخر الدین خاں
سکندر زمانی بیگم
زوجہ سرور جنگ

چھوٹی خانم زوجہ مرزا اکبر بیگ
امانی خانم
زوجہ علی بخش خاں
رنجور
غلام فخر الدین خاں
مرزا عاشور بیگ
مرزا احمد بیگ
مرزا عباس بیگ
مرزا مغل بیگ
سرور جنگ

امیر النساء بیگم
زوجہ
خواجہ حاجی خاں
جواد الدولہ
مرزا افضل بیگ
مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا غالب کے سسرالی اعزہ

- خواجہ عبدالرحمن
  - عارف جان
    - نواب احمد بخش خاں — فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ
      - از بہو خانم
        - شمس الدین احمد خاں رئیس فیروزپور جھرکہ
          - نواب مرزا خاں داغ
        - نواب بیگم زوجہ زین العابدین خاں عارف
      - از بیگم جان
        - امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو
          - علاء الدین احمد خاں
            - بشیر الدین احمد خاں
            - ضمیر الدین احمد خاں
        - ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں
          - شہاب الدین احمد خاں
            - شجاع الدین احمد خاں
          - سعید الدین احمد خاں
          - معظم زمانی زوجہ باقر علی خاں
    - زوجہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں
    - الٰہی بخش خاں معروف
      - امراؤ بیگم زوجہ مرزا غالب
      - بنیادی بیگم زوجہ غلام حسین خاں مسرور
        - علی بخش خاں رنجور
          - زین العابدین خاں عارف
            - باقر علی خاں
            - حسین علی خاں
              - محمد سلطان زوجہ شجاع الدین احمد خاں
              - فاطمہ سلطان زوجہ بشیر الدین احمد خاں
              - رقیہ سلطان زوجہ ذوالنور علی احمد
          - حیدر حسین خاں
          - غلام فخر الدین خاں
            - سکندر زمانی بیگم زوجہ سرور جنگ
              - ذوالقدر جنگ وغیرہ
        - علی نواز خاں
    - نبی بخش خاں
      - مرزا اکبر علی خاں
        - خورشید بیگم
  - قاسم جان
    - محمد بخش خاں
      - مرزا فتح اللہ بیگ خاں
    - فیض اللہ خاں
      - شرف الدولہ سہراب جنگ
        - غلام حسین خاں مسرور
          - زین العابدین خاں عارف
          - حیدر حسین خاں
    - مرزا قدرت اللہ بیگ
      - مرزا معین الدین
      - مرزا محمد حسین
      - زوجہ ضیاء الدین احمد خاں

احباب

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مرزا غالب یار باش اور دوست پرست انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ اور ہر مذہب اور ہر طبقہ و ہر پیشہ کے لوگ ان کے دوستوں کی طویل فہرست میں نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط ان کی محبت اور وسیع تعلقات کی ہمیشہ شہادت دیں گے۔ ان ہندو و مسلم دوستوں میں چار اصحاب ایسے ہیں جن کا ان کی زندگی اور کارناموں سے خاص تعلق رہا ہے۔ ان میں سب سے پہلے جہانگیر آباد کے رئیس نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی قابل ذکر ہیں۔ یہ عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر کے فرزند اور بڑے خوش ذوق اور خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ پہلے حکیم مومن خاں سے مشورہ سخن کیا اور بعد کو غالب سے اصلاح لینے لگے۔ دلی کے آخری دور کے چند بہترین علما اور صاحبان ذوق میں سے ہیں۔ مولوی حالی پانی پت سے آکر انہی کے یہاں ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے قیام پذیر ہوئے تھے اور ان ہی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

شیفتہ ان چند خوش قسمت بزرگوں میں سے تھے جن کی سخن فہمی پر غالب کو ناز تھا چنانچہ وہ شعر غالب کی نظر سے گر جاتا تھا جس کی شیفتہ تعریف نہ کرتے۔ ان کا شعر ہے ؎

غالب بہ فن ریختہ نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

سخن فہمی کے علاوہ مصطفےٰ خاں میں اور بھی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی انسانی ہمدردی تھی جس سے غالب ایسے وقت میں مستفید ہوئے جبکہ ان کے اعزہ بھی ان کی امداد کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے۔ وہ جب جوے کے الزام میں قید ہوکر محبس میں داخل ہوئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قریبی اعزہ بھی انجان بن گئے لیکن نواب شیفتہ نے خلوص سے خبر گیری کی۔ وہ روزانہ کھانا اور کپڑے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اپنی اس نظم میں جو قید خانہ میں لکھی تھی ان کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

خود چرا خوں نخورم از غم کہ بہ غمخواری من — رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی

تو انیہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است — گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

شیفتہ نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ "گلشن بے خار" بھی لکھا تھا جو اصابت رائے اور انتخاب کلام کے لحاظ سے اردو کے بہترین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جس شاعر کے متعلق جو رائے ظاہر کر دی ہے وہ ہر زمانہ میں مستند سمجھی جائے گی۔

غدر کے زمانہ میں جہاں اکثر مسلمان صاحبان علم و فضل اور امرا و رؤسا قید ہوئے نواب مصطفےٰ خاں پر بھی شبہ کیا گیا اور وہ بھی قید ہو گئے جس کا غالب کو بڑا قلق رہا۔ آخر کار جب ان کے بری ہونے کی اطلاع ملی تو مرزا بے حد خوش ہوئے۔ نواب شیفتہ نے غالب کے چند ماہ بعد تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ ان کی تعریف میں مرزا نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی تشبیب کے چند شعر یہ ہیں ؎

دست رد بر تاج قیصر می زنم | پشت پا بر تخت خاقاں می زنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ بال | در ہوائے مصطفےٰ احساں می زنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر | سکہ در شیراز و شرواں می زنم
او سر آمد مست و من چاؤش وار | بانگ بر ایسرام وارکاں می زنم
گلشن کویش گذرگاہِ من است | دم ز یاری می زنم ہاں می زنم
مہر ورزی ہیں کہ باشم ہم نشیں | من کہ زانو پیش درباں می زنم

مولانا فضل حق خیر آبادی وہ بزرگ ہستی ہے جس نے غالب کے اخلاق و عادات اور شاعری کی اصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔ ان کی بزرگی و عظمت کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرزا جیسے خود رائے اور آزادہ رو شاعر و ادیب جن کی نظر میں بڑے بڑے متقدمین شعرا و علما نہیں جچتے تھے، مولانا کی بڑی تعظیم اور عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دہلی سے سررشتہ داری عدالت چھوڑ کر جانے لگے تو مرزا نے اخبار آئینۂ سکندر میں اشاعت کے لئے ایک تحریر بھیجی جس کا آخری جملہ یہ ہے :-

"خفا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و بینش مولوی فضل حق آنا یہ بکار ہند
کہ از صد یک وا ماند و بارے آں پایہ را بہ سررشتہ داری عدالت دیوانی
سنجند ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وے خواہد بود۔"

مولانا ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا فضل امام صاحب خیر آباد کے رہنے والے تھے ان کے علم و فضل و دانش کا ہر جگہ شہرہ تھا۔ امیر مینائی نے "انتخابِ یادگار" میں فضل حق کی نسبت لکھا کہ :-

"بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، طلیق و لیق
انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق۔ جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے
صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عہدۂ لیتین
کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار اور صاحب اختیار تھے۔
جھجھر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک
سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے اور آل
دارالریاست (رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر عہدۂ لیتین
پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب فردوس مکان کو بھی آپ سے
تلمذ رہا ہے۔ اور بندگان حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ
پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے
تشریف لے گئے۔"

دہلی کے قیام کے زمانہ میں مرزا سے ایسی دوستی ہو گئی کہ عمر بھر مرزا ان کے معتقد رہے
مرزا کا جو منتخب دیوان اس وقت متداول ہے وہ مولانا ہی کا منتخب کردہ ہے۔ مولانا نے
مرزا کی شاعری کو صحیح راستہ پر ڈال دیا ورنہ کیا تعجب کہ وہ اسی طرح آوارہ گردی کرتے رہتے
مولانا نے کسی معاملہ میں ناراض ہو کر اپنی خودداری کے اقتضا سے دلی کی سررشتہ داری
سے استعفیٰ دے دیا اور وہاں سے نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجھر تشریف لے گئے۔
ان کی جدائی کا مرزا اور اہل دہلی کو بڑا صدمہ ہوا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں جہاں اکثر مسلمان علما و فضلا پر تباہی آئی مولانا بھی بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوئے اور جزائر انڈمان کو جلاوطن کر دئے گئے۔ مرزا غالب اپنے دوستوں کو کلکتہ خطوط لکھ کر ان کے متعلق حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کو آخر تک ان کی فکر رہی کہ نہ معلوم انڈمان میں کیسی گذرتی ہوگی۔ آخر کار مولانا نے غالب کی زندگی ہی میں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو غریب الوطنی میں انتقال کیا۔ ان کا نام ان شہدائے ملت کے سرفہرست رہے گا جو حق گوئی، صداقت، اور علم و فضل کی خاطر ہر طرح کا نقصان برداشت کر لیتے ہیں۔

مولانا صاحب تصنیف و تالیف تھے اور ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ | دہلی کے صدر الصدور اور غالب کے خاص احباب میں سے تھے اور علم و فضل اور سخن فہمی و سخنوری میں ممتاز تھے۔ ان کی نسبت غالب نے لکھا تھا ؎

ہست در اخوش نفسانِ سخنورکہ بود   یاد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ   حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

آزردہ ان مخصوص بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے غالب کے ذوقِ سخن پر بڑا اچھا اثر ڈالا اور خود غالب کے فضل و کمال کے معترف اور قدر داں تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن بچ بچ گئے۔ غالب کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے ان کا تذکرہ یادگارِ غالب میں جگہ جگہ نظر سے گذرتا ہے۔

منشی نبی بخش حقیر | علی گڑھ میں سر رشتہ دار تھے۔ مولوی حالی نے لکھا ہے کہ سخن فہمی و سخن گوئی

بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔" ان سے غالب کے گہرے مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب وہ دلی آئے تو مرزا ہی کے مکان پر قیام کیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنے شاگرد مرزا تفتہ کو ایک خط لکھا جس میں حقیر کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا۔ اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے۔ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنیٰ کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصہ میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔"

ظاہر ہے کہ غالب کے دل میں حقیر کی کتنی عزت تھی۔ وہ ہر جگہ ان کو بھائی اور ان کے فرزند عبداللطیف کو بھتیجے کے رشتہ سے یاد کرتے تھے۔ جب انھوں نے اپنی کتاب دستنبو

آگرہ میں چھپائی تو منشی نبی بخش ہی نے اس کی تصحیح وغیرہ کا ذمہ لیا۔ غالب کو ان پر بے حد اعتماد تھا اور ان دونوں کے آپس میں کوئی بیگانگی نہ تھی۔

تلامذہ

غالب کے تلامذہ کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا اور ان میں بھی ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ ان کے سب سے چہیتے اور مشہور شاگرد مجروح تھے۔

میر مہدی حسین مجروح

جو غالب کی دید کے مشتاق اور ان کے خطوط کے ہمہ تن منتظر رہتے تھے۔ غالب نے ان کو لکھا تھا کہ:۔

"میر مہدی: جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسکو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

میر مہدی غدر کے بعد کئی سال پانی پت میں مقیم رہے انصاریوں کے محلہ میں رہتے تھے اور وہیں سے مرزا سے مراسلت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف شاعری بلکہ انشا پردازی میں بھی مرزا غالب کے

سچے جانشین اور لائق شاگرد تھے۔ انھوں نے استاد کی وفات کا جو قطعہ تاریخ لکھا تھا وہ غالب کے سنگ مزار پر کندہ ہے ؎

کل میں غم واندوہ میں باخاطر محزوں تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

مرزا غالب کے بعض بہترین خطوط میر مہدی مجروح ہی کے نام لکھے گئے ہیں۔

منشی ہرگوپال تفتہ

یوں تو غالب کے متعدد ہندو تلامذہ قابل ذکر ہیں لیکن منشی ہرگوپال سے مرزا کو خاص تعلق رہا ہے اور مرزا تفتہ انہی کا دیا ہوا خطاب آج تک اردو ادب میں مشہور ہے۔ مرزا غالب ان کو لکھتے ہیں :۔ ”میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں“ ایک اور جگہ لکھا کہ :۔ ”مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے ۔۔۔۔۔ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا وہ تیس برس دیوانہ رہکر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور تمہاری برائی کرتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا“

مرزا تفتہ بڑے صادق الولا اور اطاعت گزار شاگرد تھے۔ انھوں نے غالب کی تصنیفات کی طباعت و اشاعت میں ان کی بڑی مدد کی۔ غالب کو بھی ان پر ناز تھا اور جو بھی کام ہوتا ان کے تفویض کر دیتے تھے۔ غالب کے اردو خطوط سب سے زیادہ انہی کے نام لکھے گئے ہیں۔

مرزا غالب
کے
اُردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصّے

غالب کے خطوں کی خصوصیتیں

مرزا غالبؔ اصل میں جدید اُردو خط نویسی کے بانی ہیں۔ ان سے قبل اُردو میں خط لکھتے وقت ان تمام لوازم نامہ نگاری کو ملحوظ رکھا جاتا تھا جو فارسی میں رائج تھے اور جن کی وجہ سے الفاظ تو زیادہ قلمبند ہوتے تھے لیکن مطلب کم ظاہر ہوتا تھا۔ فارسی خطوط میں لایعنی تکلفات بھی بہت زیادہ شامل رہتے تھے جو لکھنے والوں کے ذہنی عیش اور سیاسی و مدنی زوال کی علامت تھے۔ اور یہ سب خرابیاں اُردو میں بھی جاری ہو گئی تھیں۔ مرزا نے کچھ تو اپنی اجتہادی شان اور کچھ اپنی ضرورت و روانی کار کی خاطر ان تکلفات بارد کو ترک کر دیا۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی حسب ذیل خصوصیتیں واضح ہوتی ہیں:-

۱۔ مرزا نے القاب و آداب یا تو ترک کر دئیے یا مختصر۔ مثلاً میاں، برخوردار، بھائی صاحب، مہاراجہ یا کسی اور مناسب لفظ سے خط کا آغاز کرتے ہیں۔

۲۔ خطوں میں اکثر بات چیت یا سوال و جواب کا انداز پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے پڑھنے والے کو خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اور مکالمہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ جہاں مکالمہ کا انداز پیدا کر دیتے ہیں تو ڈراموں کے اسلوب میں سوال کرنے والے یا جواب دینے والے کے نام یا اُن کی علامت لکھنے کی جگہ خود سوال و جواب ہی میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا۔ یہ انشا پردازی کا بڑا کمال ہے۔

۴۔ مرزا غالبؔ کی ظرافت ان کے خطوط میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ ان کی شوخی تحریر فطری ہے

اور اگرچہ بعد کو دوسروں نے ان کی تقلید میں اپنے خطوں میں بذلہ سنجی سے کام لینا چاہا لیکن مرزا کی شوخئ تحریر تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔

۵۔ مرزا اپنے ہر خط میں اس امر کا بھی خاص لحاظ رکھتے تھے کہ مکتوب الیہ ان کا خط پڑھ کر محظوظ ہو۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور لکھتے تھے کہ پڑھنے والا خوش ہوتا اور ان کے خطوں کا منتظر رہتا تھا۔

۶۔ وہ اپنے مغموم و دل شکستہ دوستوں کی غمخواری اور دلدہی کے لئے اس خوبی سے عبارت آرائی کرتے ہیں کہ ان کا خط پڑھنے کے بعد یقیناً مکتوب الیہ تھوڑی دیر کے لئے دنیوی پریشانیوں اور مشکلات کو بھول جاتا تھا۔

غالب کے خطوط کی خصوصیات پر مولوی حالی نے یادگار غالب میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور بڑی دلچسپ و مفید مثالیں بھی دی ہیں۔

فہرست خطوط

بنام نواب میر غلام بابا خان بہادر (رئیس سورت)

(۱) پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا اُس میں خبر مرگ ایسی جو اس کا جواب لکھوں اور یہ میرا پہلا خط ہوگا لا محالہ مضامین اندوہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق نہ محبت نامۂ صرف تعزیت نامہ صریر قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے ...... سچ تو یوں ہے کہ یہ دہر آشوب غم ہے۔ مجموع اہل ہند ماتم وار و سوگوار ہوں تو بھی کم ہے اگرچہ میں کیا اور میری دعا کیا مگر اس کے سوا کہ مغفرت کی دعا کروں اور کیا کروں۔

یکشنبہ بست و یکم ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ششم ستمبر ۱۸۶۳ء

(۲) گھڑی کے عطیہ کا شکر ہر گھڑی اور ہر ساعت بجا لاتا ہوں پہلے تو آپ دوست اور پھر امیر اور پھر سید۔ نظر ان تین امور پر اس ارمغان کو میں نے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا۔ خدائے عالم آرائے آپ کو سلامت رکھے اور ہر گھڑی آپ کا ممد و مددگار رہے ظاہرا بوقت روانگی کنجی کا رکھنا سہو ہو گیا خیر یہاں بن جائے گی۔ بالوف الاحترام۔ خوشنودی احباب کا طالب

غالب

سہ شنبہ سوم دسمبر ۱۸۶۴ء

(۳) عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ اور مولانا سیف الحق کا مہربانی نامہ دونوں لفافے ایک دن پہونچے سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں مبارک ہو اور مبارک ہو۔ نظارہ بزم جمشید کا سے محروم رہوں گا مگر میرا حصہ مجھکو پہونچ رہیگا

خاطر جمع ہے۔ کیوں حضرت صاحبزادہ کا اسم تاریخی پسند آ گیا یا نہیں۔ نام تاریخی اور پھر سید بھی اور خان بھی۔ سید مہابت علی خاں۔ عجب ہے اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح نہ میاں داد خاں کے خط میں خیر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی یہی نام رکھئے پسند آنے نہ آنے کی تو فقیر کو اطلاع ہو جائے۔ جواب کا طالب

غالب

۱۰ اگست ۱۸۶۶ء

(۴) جناب نواب صاحب میں آپ کے اخلاق کا شاکر اور آپ کی یاد آوری کا ممنون اور آپ کے دوام دولت کا دعا گو ہوں اگر بوڑھا اور اپاہج نہ ہوتا تو ریل کی سواری میں مقفر آپ تک پہونچتا اور آپ کے دیدار سے مسرت اندوز ہوتا۔ آپ میرے شفیق اور میرے محسن ہیں خدا آپ کو سلامت با کرامت رکھے۔ خط کے دیر دیر لکھنے کا سبب ضعف و نقاہت ہے اگر میرے اوقات شبا روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیونکر ہے...... ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترواں سال شروع ہوگا۔ ستر ا بہتر ا بہرہ بوڑھا اپاہج آدمی ہوں جو عنایت تم میرے حال پر فرماتے ہو صرف تمہاری خوبی ہے میں کسی لایق نہیں۔ نجات کا طالب

غالب

چہار شنبہ ۳۱ مئی ۱۸۶۷ء

(۵) پہلے اس سے آپ کا مودت نامہ پہونچا ہے وہ میرے خط کے جواب میں تھا اس کا جواب نہیں لکھا گیا۔ پرسوں میاں سیف الحق کا خط پہونچا خط کیا تھا خوان دعوت تھا میں نے کھانے بھی کھائے میوے بھی کھائے ناچ بھی دیکھا گانا بھی سنا خدا تم کو سلامت رکھے کہ اس

نالائق درویش گوشہ نشیں پر اتنی عنایت کرتے ہو۔ نجات کا طالب

غالب

سہ شنبہ ۳ر اپریل ۱۸۶۷ء

(۶) جناب سید صاحب قبلہ بعد بندگی عرض کرتا ہوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہونچا آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیر و عافیت کبھی کبھی لکھا کر آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی ضعیف ہوگئی متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے تو میں مطلب کہتا گیا وہ لکھتے گئے یہ حسن اتفاق ہے کہ کل آپ کا خط آیا آج ہی ایک دوست میرا آ گیا کہ یہ سطریں لکھوا دیں اور یہ آپ کبھی نہ فرمائیں کہ منشی میاں داد خاں سے مجھے قطع محبت ہوگیا ہے منشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط سے آپ کی محبت دل و جان میں اسقدر سما گئی ہے جیسا اہل اسلام میں بلکہ ایمان کا پس ایسی محبت کا موقوف ہونا کبھی ممکن نہیں۔ امراضِ جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجومِ غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسا ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے بس اللہ ہی اللہ ہے۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں کو سلام کہئے گا اور یہ خط پڑھا دیجئے گا۔ نجات کا طالب

غالب

روز چہار شنبہ ۴ر اپریل ۱۸۶۷ء

(۷) نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو مسرت بعد مسرت و جشن مبارک و ہمایوں ہو رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی۔ بسواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج کانوں سے بہرا۔ ضعف بصارت۔ ضعف دماغ۔ ضعف دل۔ ضعف معدہ۔ ان سب

ضعفوں پر ضعف طالع۔ کیونکر قصد سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں گھنٹہ بھر میں دو بار...... کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے درد کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں۔ حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں...... خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی سیدانی صاحبہ کی بسم اللہ کی تاریخ بھی لکھا چاہیئے' مادہ خجستہ بہار۔ ذہن میں آیا سات عدد کم پائے۔ خجستہ بہار پر ادب کے اعداد بڑھائے۔

(۸) آپ کا بندہ منت پذیر غالب خونیں صفیر یوں نواسنج ہوتا ہے کہ عنایت نامہ عز ورود لایا اور مژدہ قبول سے میرا رتبہ بڑھایا جو کچھ میرے حق میں ارشاد ہوا ہے اگر اس کو قدر دانی کہوں تو لازم آتا ہے کہ اپنے کو ایک طرح کے کمال کا مالک مانتا ہوں۔ البتہ آپ نے از راہ حق پسندی سخن کی قدر دانی اور میری قدر افزائی کی ہے جو اغلاط فارسی دانان ہند کے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے اُن کو دفع کیا ہے تو کیا برائی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے گمنام اپنی شہرت کے لئے مجھ سے لڑتے ہیں واہ واہ اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں۔ عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہونچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔ آج سے کاپی لکھی جانے لگی اور تصحیح کو میرے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے بس اب اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے۔ نجات کا طالب **غالب** یکشنبہ ۱۷ اگسٹ ۱۸۶۶ء

بنام منشی سیف الحق میاں داد خاں سیاح (متوطن سورت)

(۹) برخوردار تمھارا خط پہونچا لکھنو کا کیا کہنا ہے وہ ہندوستان کا بغداد تھا اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سرو پا وہاں پہونچا امیر بن گیا اس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب نا انصاف سے ہاتھ آ گیا اور میں نے نورِ چشم منشی شیو نارائن کو بھیج دیا یقینِ کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہونچ جائے گا۔ طریقہ سعادتمندی یہ ہے کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتہ ہم پر ظاہر کرتے رہو ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی شرمندہ بھی ہیں۔

شنبہ ۳۰ جون ۱۸۶۰ء

راقم۔ اسد اللہ خاں

(۱۰) سعادت و اقبال نشان منشی میاں داد خان سے میں بہت شرمندہ ہوں کہ انکے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے گم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پاسخ نگار نہوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں اُس خط کے جواب میں ہیں جو بنارس سے آیا ہے۔ بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور چراغِ دیر اس کا نام رکھا ہے۔ ...... میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنو سے بنارس تک کے سفر کی سرگذشت لکھی ہے اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر سیاحت کو

بہت دوست رکھتا ہوں ...... خیر اگر سیر و سیاحت میسر نہیں نہ سہی۔ ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کی میاں داد خاں سیاح کی سرگذشت سیر و سفر ہی سہی۔ غزل تمھاری رہنے دیتا ہوں اس کے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے جیسا تم نے وعدہ کیا ہے جب اور غزلیں بھیجو گے اُنکے ساتھ ان کو بھی دیکھ لوں گا۔ بلکہ احتیاط مقتضی اس کا ہے کہ اُن غزلوں کے ساتھ اس غزل کو بھی لکھ بھیجنا۔ ناتوانی زور پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی گرانی، رکاب میں پاؤں ہے باگ پر ہاتھ ہے بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

نجات کا طالب غالب

دوشنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۱ء

(۱۱) صاحب کل آپ کا خط آیا میرا دھیان لگا ہوا تھا کہ آیا میاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے ہیں۔ پہلا خط تمہارا جس کا حوالہ اس خط میں دیتے ہو میں نے نہیں پایا ورنہ کیا امکان تھا کہ جواب نہ لکھتا..... ہائے مولوی محمد محسن اور مولوی عبدالکریم اس عہد میں اگر اُن بزرگواروں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا۔ وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ ہاں خان صاحب آپ جو کلکتہ پہونچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اُس کا کیا حال ہے گزارا کس طرح ہوتا ہے۔ غالب

جمعہ ۴ر اکتوبر ۱۸۶۱ء

(۱۲) صاحب آج تمھارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں ..... ان دنوں ضعفِ دماغ و دورانِ سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والیٔ رامپور کا بھی بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہوا ہے دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی تمھاری بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں خاطر جمع رکھو۔ جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا تو یہ بھی دیکھی جائیں گی۔ جب حال یہ ہو کہ اصلاح نہ دے سکوں تو فکرِ تاریخ کیا کروں۔ اگر میرا حال درست ہوتا تو جناب مولوی عبد الغفور خاں صاحب نساخ کے دیوان کی تاریخ ضرور لکھتا اور اس خدمتگزاری کو اپنی سعادت سمجھتا۔ آپ جناب مولوی صاحب سے میرا اسلام کہیں اور یہ میرا رقعہ ان کو دکھا دیں۔

نجات کا طالب **غالب**

چہار شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۶۱ء

(۱۳) منشی صاحب سعادت و اقبال نشان۔ شکوہ تمھارا میرے سر آنکھوں پر۔ مگر کوئی خط تمھارا جواب طلب نہ تھا اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اٹھایا کیا کروں ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھانے وقت پلنگ پر سے اتر بیٹھتا ہوں کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا کہاں تک جیوں گا۔

۱۶ راگست ۱۸۶۳ء

(۱۴) آئیے بیٹھیے مولانا سیاح سلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ سورت کا پہونچنا بہر صورت

مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم اپنے وطن پہونچے۔ لیکن تم کو چین کہاں خدا جانے کے ہفتے یا کے مہینے ٹہرو گے اور پھر سیاحت کو نکلو گے۔ جی میں کہو گے آؤ اب دکن کی سیر کریں۔ حیدر آباد اور نگ آباد دونوں شہر اچھے ہیں اُن کو دیکھیں ......
مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں۔ یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

غالب

شنبہ ۲ ذی قعدہ ومئی

(۱۵) فقیر کی طرف سے دعا سلام قبول کریں۔ چھوٹے صاحب کی تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خاں سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پہونچنے کی اطلاع دینا، سو اب تمھاری تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اطلاع دی ہے حال تصویر کا یہ کہ میں نے اُسے سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی خیر دیدار تو میسر ہوا گفتار بھی اگر خدا چاہیگا تو سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں مگر فقیر اس کا معتقد نہیں اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے آگے پہونچے اور پنجے کا پتہ نہیں۔ مگر ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔ نجات کا طالب

غالب

۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

(۱۶) دعا اور سلام اور شکر اور سپاس تمھارا خط مرقومہ ۳۰ اگسٹ پرسوں بروز جمعہ

۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہونچا۔ کل دسویں ستمبر ماہ حال کو سو روپیہ مندرجہ اس کے ایک صراف سے وصول ہو گئے چھوٹے صاحب نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمت کی اس صرف میں میرا کام ہوا اور اُن کا نام ہوا۔ اللہ اللہ اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا اور نہ انھوں نے مجھکو دیکھا نہ کوئی میرا حق ان پر ثابت نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا تمھارا بھی احسان مانوں گا اب دو ایک دن میں کاغذ آ جائے تو اس کا انطباع شروع ہو جائے۔ تم نواب صاحب کو میرا سلام کہو اور یہ خط دکھادو اور عرض کرو کہ آج تک کسی بھائی یا کسی دوست کا روپیہ پیسے کا احسان متحمل نہیں ہوا تھا اب احسان بھی اٹھایا تو اپنے آقا یعنی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرزند کا۔ نجات کا طالب

غالب

دوشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء

(۱۷) صاحب میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزانِ وطن کو دیکھ کر خوش ہوئے اور مع الخیر والعافیۃ اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آ پہونچے۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ اس خط میں سلام صرف وفور اشتیاق سے لکھا ہے محبت نامہ جدا گانہ جلد بھیجوں گا۔ نجات کا طالب

غالب

سہ شنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء

(۱۸) فقیر گوشہ نشیں کا سلام پہونچے۔ تمھارا کوئی خط سوائے اس خط کے جس کا جواب لکھتا ہوں ہرگز نہیں پہونچا بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا

کل ناگاہ تمہارا خط پہونچا آج اُس کا جواب لکھتا ہوں ۔ پھر میں تو کھو دینے کا نہیں جو اسقدر عذر چاہتے ہو ۔ کھد وادینے میں کیا تکلیف اور کیا زحمت ۔ میں احباب کا خادم ہوں ... اجی سیاح صاحب ہمارا دھیان تم میں لگا رہتا ہے کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو ۔ میں اب گمان کرتا ہوں کہ اگر میر غلام بابا خاں صاحب کو مہر کھدوانی نہ ہوتی اور وہ تم سے نہ کہتے تو تم ہرگز مجھ کو خط نہ لکھتے ۔ یہ تمہارا خط گویا میر غلام بابا خاں کے حسب الحکم تھا ۔ جی میں آیا تھا کہ انھیں کو اس کا جواب لکھوں اور ان کے نام کا خط بھیجوں مگر پھر سوچا کہ تم آزردہ ہو جاؤ گے ۔ تمھیں کو خط لکھا ۔ بھائی یہ طریقہ فراموش کاری کا اچھا نہیں ۔ گاہ گاہ خط لکھا کرو ۔ نجات کا طالب غالب

سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۶ء

(۱۹) مولانا سیف الحق اب تو کوئی خط تمہارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا ۔ بھلا یہ تو فرمایئے کہ یہ ڈھائی روپیہ کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں اگلے پانچ روپیہ پر میں بے مزہ ہوا تھا یہ ڈھائی اور طرہ ہوئے ۔ بہرحال ان کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں اس رقعہ کا جواب جلد لکھو ۔ ٹوپیاں بعد عید بھیجی جائیں گی ۔

۲۳ اپریل ۱۸۶۶ء عنایت کا طالب غالب

(۲۰) صاحب میرا سلام ۔ تمہارا خط پہونچا ۔ دونوں غزلیں دیکھیں خوش ہوا فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوہ کی رعایت کی جائے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے یاد کرو کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہوئی ہو ۔ خصوصاً

روزمرہ اردو میں دونوں غزلیں لفظاً اور معناً بے عیب ہیں۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ میر غلام بابا خاں صاحب واقعی ایسے ہی ہیں جیسے تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گذرا ہوگا اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بیشک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب فیہ۔ کیا فرمائش کروں اور کیا تم سے منگاؤں؟ وہاں کونسی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھکو بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہونچنے کی کیا صورت۔ مالوہ کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کرکے مشہور ہے اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنے میں محض تکلف ہے۔ روپیہ کے آم اور چار روپیہ محصول ڈاک اور پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو دار افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ اوائل جون ماہ حال میں ایک ہفتہ مینھ برس کر پھر وہی آگ برس رہی ہے اور لو چل رہی ہے۔

سہ شنبہ ۱۷ رجون ۱۸۶۶ء

(۲۱) بھائی سیف الحق تمہارا خط پہونچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر اُن کے عتاب کی پاتا تو اُن سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں تم بُرا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اُس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔ صاحب اُس

بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں گوشہ نشیں آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا اجی وہ تو میں نے نواب صاحب کو بمبئی میں ایک بات لکھی تھی دونا نہ اختلاط تھا کہ بمبئی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں گا۔ بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں۔ غذا چھٹا آٹا، کھانا کیا کھاؤں۔ بمبئی، صورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں اگر وہاں آتا اور شربت محتمل ہوتا تو پی لیتا۔ نجات کا طالب

غالب

۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

(۲۲) صاحب میں تم سے شرمندہ۔ پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا۔ میں قصیدہ کسی کتاب میں رکھ کر بھول گیا اب دوسرا خط دیکھ کر قصیدہ یاد آیا ہر چند ڈھونڈا نہ پایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس قدر مجھکو یاد ہے کہ اُسی وقت میں نے ان اشعار کو سراسر دیکھ لیا تھا۔ اشعار سب ہموار تھے۔ تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزرانو اور مع الخیر وطن کو جاؤ لیکن بھائی وطن پہونچکر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتہ لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں

سہ شنبہ ۱۰ نومبر ۱۸۶۶ء

(۲۳) منشی صاحب، وہی جہان، وہی زمین وہی آسمان، وہی سورت۔ بمبئی۔ دلی وہی نواب میر غلام بابا خان، وہی سیف الحق سیاح وہی غالب نیم جان انگریزی ڈاک جاری ہرکاروں کو ریل کی سواری۔ ربیع الاول میں تمہارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی ۲۶ ہے صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں، ۸ بج گئے ہیں اسوقت تک

نہ کوئی تمہارا خط آیا نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو اور اس خط میں ترکِ نامہ و پیام کا سبب لکھو۔ آج ہی کے دن ایک پارسل چھ ٹوپیوں کا ارسال کرتا ہوں، خدا کرے پارسل پہونچ جائے اور ٹوپیاں تمہارے پسند آئیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہونچانا اور عتاب کی وجہ دریافت کر کے لکھنا۔

۳ر جنوری ۱۸۶۷ء　　نجات کا طالب غالب

(۲۴) فقیر غالب علیشاہ کی دعا پہونچے۔ پرسوں نواب صاحب کا خط اور کل تمہارا خط آیا۔ صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے روپیوں کی ٹوپیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہے تم پہنو چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔ یہ جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی..... حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا جواب کیا لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں، میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل۔ علیل۔ فقیر۔ حقیر آدمی ہوں یہ اُن کی بزرگی اُن کی خوبی اُن کی مہربانی ہے، حق تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔　دیدار کا طالب

سہ شنبہ ۱۲ر فروری ۱۸۶۷ء　　غالب

(۲۵) بھائی تم جیتے رہو اور مراتب علیا کو پہونچو ایک ہنسی کی بات سنو۔ تمہارا خط منشی کنھیا لال کے نام کا میرے پاس آیا۔ ہر چند میں نے خیال کیا اس نام کا کوئی آشنا مجھے یاد نہ آیا،

یہ نادانی اُن کی کہ مجھ سے کہہ نہ دیا کہ میرے نام کا خط آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ پھیری میں یا جو خط آیا میں نہ نام سے واقف نہ مقام سے واقف۔ خط پھیر نہ دوں تو کیا کروں۔ خط کے واپس کرنے کے بعد ایک دن آپ بھائی مرزا محمد حسین خاں کے ساتھ میرے پاس آئے اور تعارف قدیم یاد دلایا۔ دیکھنا میاں کیا خوب بیان ہے فرماتے ہیں کہ میں غدر سے پہلے دو تین بار تیرے پاس حاضر ہوا ہوں۔ انصاف کرو۔ دو تین ملاقاتیں اور دس گیارہ برس کی بات۔ میں نسیاں کا پتلا۔ میرا قصور کیا۔ بہر حال یہ شریف ہیں اور عمدہ روزگار کئے ہوئے ہیں۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء

اسد اللہ خاں غالب

(۲۶) منشی صاحب سعادت و اقبال نشان عزیز تر از جان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب کی دعا پہونچے۔ پرسوں ایک خط تمہارا اور ایک خط چھوٹے صاحب کا پہونچا۔ تمہارے خط میں پچاس پچاس روپیہ کے دو نوٹ پہونچے۔ سو روپیہ وصول ہو گئے۔ آج تم کو اطلاع اور نواب صاحب کو شکریہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ بھائی تم نے اخبار اطراف و جوانب یا میرا حال دیکھا ہوگا۔ میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔

۲۳ اپریل ۱۸۶۷ء

(۲۷) غالب ناتواں نیم جان کی دعا پہونچے۔ بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں۔ اور پھر اس

موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں رات کو صحن میں سوتا ہوں صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اُس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو بدستور دو آدمی لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں ..... اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گذر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔ تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اتروا تا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے میں نے اُن سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ۔ محرم۔ یہ پانچواں مہینہ ہے، آج تک نہیں آئے ..... میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار ہا ہے ایک میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ بسواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا اس کو موقع و محل بتا دیا جو میں کہتا گیا اس طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے اکمل المطابع میں بھیج دیا۔ ہفتۂ آئندہ میں تم بھی دیکھ لو گے۔ مرگ ناگاہ کا طالب

غالب

۱۱ر جون ۱۸۶۷ء

(۳۸) نورِ چشم اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالبِ نیم جاں کی دعا پہونچے۔ واقعی تمہارے دو خط آئے ہیں۔ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ۔ آنکھوں میں ضعف ہے۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں دوست آشنا کوئی

آجاتا ہے تو اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ بھائی میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں سو اُن کے اخبار میں میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہیں کیا اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں۔ اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا اپاہج پورا بہرا آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں ..... تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں ..... تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی، اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۴ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی نوجوان ہو حق تعالٰے تمہیں صبر اور نعم البدل دے۔

غالب

۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

(۲۹) صاحب تمہارے خط کے پہونچنے سے کمال خوشی ہوئی۔ ٹوپیاں اگرچہ تمہارے سر پر ٹھیک نہ آئیں لیکن ضائع نہ گئیں۔ میرے شفیق اور تمہارے مربی کے صرف میں آئیں تم کو اور ٹوپیاں بھیجوں گا۔ مصور سے سخت عاجز ہوں وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں جعفر علی

بہتان لگانے کی خو کس سے سیکھے ہو۔ میرے پاس کوئی غزل تمھاری نہیں ہے۔ نواب صاحب کو سلام کہنا اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان سمجھنا۔ سیف الحق کی نذر تصور نہ کرنا۔ نجات کا طالب

غالب

۲۵ جنوری ۱۸۶۸ء

بنام مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکا (حیدر آباد)

(۴۰) بھائی میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے ظاہرا معاملۂ عالمِ ارواح ہے۔ اسبابِ ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمہارے خط کا جواب مع اوراقِ مسودہ روانہ ہو چکا ہے۔ وقت پر پہونچے گا۔ ستر ابہترا اردو میں ترجمہ پیرِ خرف ہے میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں اخرف ہوا حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظ کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پہ لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سرِ شام تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　　القصہ دیے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی ایک اور خط ضروری لکھنا تھا۔ بکس کھولا تو پہلے تمہارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے۔ ناچار اب

کتابت جداگانہ میں لکھتا ہوں تا کہ خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں
قوم کا ترک سلجوقی ہوں ۔ اور دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں
آیا سلطنت ضعیف ہو گئی تھی ۔ صرف پچاس گھوڑے ، نقارہ ، نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا ۔
ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا ۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف
الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا ۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب
آصف الدولہ کا نوکر رہا ۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا ۔ تین سو
سوار کی جمعیت سے ملازم رہا ۔ کئی برس وہاں رہا ۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں
جاتی رہی ۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا ۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا ۔ وہاں کسی لڑائی
میں مارا گیا ۔ نصر اللہ بیگ خاں بہادر میرا چچا حقیقی ، مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار
تھا ۔ اس نے مجھے پالا ۔ ۱۸۰۶ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا ، صوبہ داری کمشنری
ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا ۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی
بھرتی کا حکم دیا ۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا ۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ
ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ رسالہ بھر مرزبانی کی تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا ۔
رسالہ برطرف ہو گیا ۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں ۔ پانچ برس کا تھا
جو باپ مر گیا ۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا ۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا ۔ نواب گورنر سے ملنے کی
درخواست کی گئی ، دفتر دیکھا گیا ۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا ۔ ملازمت ہوئی ۔ سات
پارچے اور جیغہ ، سرپیچ ، مالائے مروارید ، یہ تین رقم خلعت ملا ۔ ازاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا

مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے میری بریت کی درخواست گذری تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرض کہ یہ خلعت ریاست کا ہے عوض خدمت نہیں، انعامی نہیں، معوج الذہن نہیں ہوں، غلط فہم نہیں ہوں، بدگمان نہیں ہوں، جو جس کو سمجھ لیا اُس میں فرق نہیں آتا۔ دوست سے راز نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدرآباد سے گمنام خط ڈاک میں بھیجا۔ بند بری طرح کیا تھا۔ کھولنے میں سطر کٹ گئی۔ بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بھیجنے والے کی غرض یہ تھی کہ مجھ کو تم سے رنج و ملال ہو۔ قدرت خدا کی میری محبت اور بڑھ گئی اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہ تمہارے پاس اس خط میں ملفوف کرکے بھیجتا ہوں۔ زنہار دستخط کو پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا۔ مدعا اس خط کے بھیجنے سے یہ ہے کہ تمہاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔

(۳۱) تم چراغ دودمانِ مہر و وفا اور منجملہ اخوان الصفا ہو۔ مجھ سے تمہیں محبت روحانی ہے گویا یہ جملہ تمہاری زبانی ہے۔ دوست کی بھلائی کے طالب ہو اس شیوہ میں شریک غالب ہو ایک خواہش میری قبول ہو تاکہ مجھ کو راحت حصول ہو۔ مبادی کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ واقعہ حال دلنشیں کرتا ہوں۔ جناب مولوی مویدالدین صاحب کے بزرگوں میں اور فقیر کے بزرگوں میں باہم وہ خلت وصفت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم میں اور اُن میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم ہے اور ہمیشہ یوں ہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔ اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور اُن کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام

میرے کلیات کی پارسل کا ان کے پاس اور اُن کے ذریعہ عنایت سے اُس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گذرنا اور جو کچھ اس کے گذرنے کے بعد واقع ہوا دریافت کرکے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

غالب

جمعہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۳ء

(۳۲) بندہ پرور تمھارے دونوں خط پہونچے۔ غالب گستہ دم کوتہ قلم نہ لکھے تو یہ اور بات ہے۔ دونوں خط آپ کے اور ایک پارسل محمد نجیب خاں کا بہ تقدیم و تاخیر دو سہ روز موصول ہوے۔ آپ کا پارسل بعد مشاہدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ خان صاحب کے پارسل میں ایک کتاب ارمغان اور اوراقِ اصلاح بھیجے جائیں گے۔

غالب

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء

(۳۳) جاناں بلکہ جان مولوی منشی حبیب اللہ خان کو غالب خستہ دل کا سلام اور نور دیدہ و سرور سینہ منشی محمد میراں کو دعا اور مجھ کو فرزند ارجمند کے ظہور کی نوید۔ جو نگارش صاحبزادے کی طرف سے تھی، رسم الخط بعینہ تمھاری تھی۔ اب تم بتاؤ کہ رقعہ اُس کی طرف سے تم نے لکھا ہے یا خود اُس نے تحریر کیا ہے۔ لڑکا تمھارا تمھارے ساتھ حیدر آباد نہیں آیا۔ ظاہراً تم نے وطن سے بلایا ہے مفصل لکھو کہ نخلِ مراد کا ثمر یہی ہے یا اس کے کوئی بھائی بہن اور بھی ہے یہ اکیلا آیا ہے یا قبائل کو بھی تم نے اس کے ساتھ بلایا ہے۔ ہاں صاحب محمد میراں بہ اسم مقتضی اس کا ہے کہ آپ قوم کے سید ہوں۔ یوسف علی خاں شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہِ دہلی کی سرکار سے تیس روپیہ مہینہ پاتے ہیں، جہاں سلطنت گئی، وہاں وہ تنخواہ بھی گئی۔

شاعر ہیں، ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں، مضطر ہیں، ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں
علم اسی قدر کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں اُن کو بجائے فرزند
سمجھتا ہوں۔ بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینہ مقرر کر دیا ہے مگر بسبب کثرت عیال وہ اُن کو
مکتفی نہیں۔ تم ان کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ صاحب! میں
بعین عنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔۔۔۔۔

(۴۴) میرے مشفق میرے شفیق، خدا سے سچ و پوچ کے ماننے والے۔ مجھ سے بُرے کو اچھا
جاننے والے۔ میرے محب۔ میرے محبوب۔ تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان
ہوں۔ آگے بہرا تھا اب اندھا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے۔ رعشہ و ضعف بھی۔ جہاں
چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں۔ حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت
جیا، اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط تمہارا پہونچا اُس سے تمہارا
مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا سب شعر اچھے اور لطیف،
حافظہ کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ایک شعر میں کوئی لفظ بدلا گیا
تھا۔ بغرض کہ وہ غزل بعد اصلاح تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔ کل ایک
خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا
خط کو نوید رفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔ صاحب میرے
نام کا خط جہاں سے روانہ ہوگا وہیں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر
کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہونچے۔ وہاں کے ڈاک خانے کے کارپردازوں کو اختیار ہے کہ

مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ جواب خط کا طالب

غالب

جمعہ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء

(۳۵) منشی صاحب الطاف نشان سعادت و اقبال توامان منشی حبیب اللہ خاں کو غالب سوختہ اختر کی دعا پہونچے۔ تمہارا خط پہونچا۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ تم میری بابت پوچھتے ہو مگر میں کیا لکھوں؟ ہاتھ میں رعشہ۔ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اس سے خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بو پہونچتی ہے ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ بھائی اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے، بالکل میرا یہی حال ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دوم شوال ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء

اپنی مرگ کا طالب غالب

(۳۶) دوست روحانی و برادر ایمانی مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی کو فقیر غالب کا سلام تم نے یوسف علی خاں کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور ان کا تخلص اور ان کا خطاب کس سے معلوم کیا۔ بغیر نشان محلہ کے ان کو خط کیونکر بھیجا اور وہ خط ان کو کیونکر پہونچا ع حیرت اندر حیرت است اے یار من۔ پہلے یہ تو کہو کہ درفش کاویانی اور وہ قطعہ تم کو پہونچا ہے یا نہیں اگر پہونچا ہے تو مجھ کو رسید کیوں نہیں لکھی۔ اگر یہ پارسل پہونچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچہ ثانی جدید کی داد دو۔ اور اگر نہیں پہونچا تو مجھ کو اطلاع دو کہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔ زرنقش[illegible]

اس مہینے یعنے رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہترواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ جواب خط کا طالب

غالب

۴ر دسمبر ۱۸۶۶ء

(۴۷) جانِ غالب تم نے بہت دن سے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ ایک خط میرا ضروری جواب طلب گیا ہوا ہے اور آمد و رفت ڈاک کی مدت گذر گئی اس کا جواب تو سو کام چھوڑ کر لکھنا تھا۔ مؤید برہان میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں وہ تمہارے پاس بھیجوں گا" شرطِ مودت بشرطِ آں کہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب میرے کھینچے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میاں محمد میراں کو دعا۔ جواب کا طالب

غالب

۱۴ر مارچ ۱۸۶۷ء

(۴۸) بندہ پرور کل آپ کا تفقد نامہ پہونچا۔ آج میں پاسخ طراز ہوا جس کاغذ پر میں یہ نقوش کھینچ رہا ہوں۔ آپ کے خط کا دوسرا ورق ہے پہچان لیجئے۔ اور معلوم کیجئے کہ

آپ کا مجموعۂ کلام معجز نظام اور اس کے بعد پیہم دو خط پہونچے۔ میں صحیفۂ شریفہ کی رسید لکھ چکا ہوں بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغان کا شکر اور اوراقِ اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھ دی ہے۔ پارسل کے سرنامہ سے میرا نام مٹا نہیں۔ پارسل تلف ہوا نہیں۔ آٹھ دس روز ہوئے ہوں گے کہ وہ مجلد اسی پارسل میں کہ اس کو روگرداں کر لیا ہے بعد ادائے محصول آپ کا نام لکھ کر روانہ کر دیا ہے یقین ہے کہ بعد آپ کے خط کی روانگی کے آپ کے پاس پہونچ گیا ہوگا۔ ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدرداں پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی۔......

بنام منشی ہرگوپال صاحب المخاطب بہ میرزا تفتہ (آگرہ)

(۳۹) شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمھارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے مگر ہاں ع شعر خود را چہ کنم کوز خود برنج درست۔ والسلام والاکرام۔

اسد اللہ

رقم زدہ ۱۹ فروری و مراسلہ بست و یکم فروری ۱۸۵۲ء

(۴۰) کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ' منشی ہرگوپال تفتہ' تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب یہ تم جانتے

ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دمبدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں، پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے جب اُن عالم ظاہری کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا، اُن معنوی پوتوں سے کہ اُن میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور اُن کو دولت اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں یعنی نتائج طبع کو شہرت فروغ شہرت اور حسن قبول عطا فرمادے۔ والدعا۔

اسد اللہ

جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء

(۴۱) بھائی آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں، جدن میرا خط پہونچے اگر وقت ڈاک کا ہو تو اُسی وقت جواب لکھ کر روانہ کردو اور اگر وقت نہ رہا تو چارو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشاء تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی، کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا، جلد لکھو کہ کیا صورت ہے۔ راجہ کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اُسی علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔ نوشتۂ چاشتگاہ۔ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء — ضروری جواب طلب

(۴۲) بھائی میں نے مانا تمہاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فر
نہ ہوگی، پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا۔ اس میں ضرور تر
معنی بھی ملحوظ رکھا کرو۔ اور جو کچھ لکھو اُس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔ ہنسی آتی ہے تمہاری با
خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے۔

۲۱ ماہ اگست ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۴۳) منشی صاحب تمہارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرز
میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آ
پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہ
ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے ہرگز بھو
نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اشعارِ سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔
اچھے ہو لینے کے اُن کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہزار جرِ ثقیل لکھی گئی
ہیں۔

اسد اللہ روز پنجشنبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء

(۴۴) صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم
باہم دوست تھے، اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے
دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوستِ دلی تھے اور منشی
نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلا

نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا، اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے
ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اُس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا
کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی
اور اُس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں
پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب، اہل حرفہ اگر کچھ
ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں، اب پوچھو تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا
صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور
یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر
والی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لیا تھا کہ بروقتِ غارت دہلی
یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں
اور یہ شہر کہاں، مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے غرض کہ
اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت
بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر
بے چراغ پڑے ہیں۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار
یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہئے۔ مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ اسوقت
تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارہ کو دیا۔

(۴۵) میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے۔ بنک گھر میں سے

خدا کرے تمہارا روپیہ مل جائے۔ بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، تو بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گذرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔ والدعا

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء وقت نیمروز۔ غالب

(۴۶) صاحب کیوں مجھے یاد کیا کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی، پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

(۴۷) صاحب! ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں

یرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے اُس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی
قوم کا کھتری خوبصورت وضعدار نوجوان ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اُس کا باپ
ہے سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ
رثیہ ہو کہ وہ اُس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور
شعر متروک، مہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے جو خونچکاں شعر تم نکالو گے وہ مجھ سے
ہاں نکلیں گے، بطریق مثنوی بیس تیس شعر لکھدو۔ مصرع آخر میں مادۂ تاریخ ڈال دو۔ نام
س کا برج موہن تھا۔ اور اُس کو بابو بابو کہتے تھے۔ چنانچہ میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں چاہو
اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اُسی بحر میں اور اشعار لکھ لو۔ چاہو کوئی اور طرح
نکالو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور بابو برج موہن
سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا وہ شعر میرا یہ ہے ؎

برم چوں نام بابو برج موہن　　چکد خونِ دل ریش از لب من

غالب

روز جمعہ سی ام۔ اپریل ۱۸۵۸ء

(۸۴) کیوں صاحب مجھ سے کیوں خفا ہو آج مہینا بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائیگا
کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس
دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بالمکند اُس کا بیٹا یہ
دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں اس سے گذر کر لکھنو اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع
سے خطوط آتے رہتے تھے ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں وہ

وہ آمدِ خطوط کی موقوف صرف تم تین صاحبوں کے آنے کی توقع اُس ہیں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔ سنو صاحب اپنے پر لازم کرلو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا اگر کچھ کام آپڑا دو خط تین خط ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔ بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا اس کا جواب بھیج دیا گیا۔ آگرہ کا حال کیا ہے، وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں۔

شنبہ ۱۹؍ جون ۱۸۵۸ء

غالب

(۴۹) میرزا تفتہ تمہارے اوراقِ مثنوی کا پیم فلٹ پاکٹ پرسوں ۱۵؍ اگست کو اور جناب میرزا حاتم علی صاحب کی نثر شاید آغاز اگست میں روانہ کر چکا ہوں۔ اُس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم ہوا کہ میری خدمت مخدوم کے مقبولِ طبع ہوئی یا نہیں۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں اور کس خیال میں ہیں۔ اب ایک امر سنو میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے۔ اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے وہ عربی انگریزی۔ ہندی جو ہیں وہ لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام منشی ہرگوپال منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ شیوا زبان لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعہ میں ہے۔ نہ چھدرا نہ گنجان۔ اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں ۲۰ سطر اور کسی میں

۲۲ سطر بلکہ کسی میں ۱۹ سطر بھی آئے۔ چالیس صفحہ یعنی ۲۰ ورق ہیں۔ اگر ۲۱ سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک ہے اس میں کاپی نگار خوشنویس نہیں ہے۔ اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔ غالب نگاشتہ در وال داشتہ۔ سہ شنبہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء جواب طلب واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔

(۵۰) بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک بھیج چکا ہوں اب اس وقت تمہارا خط اور آیا۔ سنو صاحب لفظ مبارک میم حا میم دال اُس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی محمد اسداللہ خاں نہیں لکھا جاتا۔ میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزا و مولانا و نواب۔ اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو لکھو۔ بھائی کو کہنا اُن کے خط کا جواب صبح کو روانہ کر چکا ہوں مرزا تفتہ اب تم تزئین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادر زادہ سعادتمند کو تکلیف نہ دو...

(۵۱) للہ الشکر تمہارا خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم میرا خط اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہرحال اس نمونہ کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیہ پر چڑھیں اس کی روشش دلآویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ میں نے جو تم کو میرزائی کا خطاب دیا ہے اُن فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ

سمجھا ہے، خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بدل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہوگیا ہے۔ چھ جلدوں کی آرائشگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیئے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حروف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھینچ جاتی ہے پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے، بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری آن کی میرے کس دن کام آوے گی میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں۔ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا۔ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔

جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز غالب

(۵۲) صاحب تمہارا خط آیا میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔ وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل حدیقہ میں مرقوم ہے۔ بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے۔ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں نہ میرے سمجھانے کو

دخل ہے نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک حرج ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہوتا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام　　زیں ہوسہا بگذر یا مگذر میگذرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیئے جاتا ہوں باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو جس طرح رہو، ہر ہفتہ میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یکشنبہ ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء

(۵۳) کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں، بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ ۲دو ۲دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو، میری دل لگی ہو جاتی ہے، دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے، یہ کیا سبب دس دس بارہ ۱۲ بارہ ۱۲ دن سے تمھارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالب

سوموار ۷ر دسمبر ۱۸۵۸ء

(۵۴) دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے' لطف اس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

غالب

نگاشتہ دوشنبہ ۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء

(۵۵) میری جان کیا سمجھے ہو' سب مخلوقات تفتہ و غالب کیونکر بن جائیں ع ہر یکے را بہر کارے ساختند۔ مصری میٹھی' نمک سلونا۔ کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلے گا۔ اب جو میں اُس شخص کو نصیحت کروں وہ کیا سمجھے گا کہ غالب کیا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اُس سے کیا رسم و راہ ہے' بے شبہ جانے گا کہ تفتہ نے لکھا ہو گا۔ میں اُس کی نظر میں سُبک ہو جاؤں گا اور تم وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے' باقی رہی وہ عزیز داری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں' اُس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اُس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اُس شخص سے خس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ از راہِ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے۔ زین العابدین خاں عارف میرے سالے کا یہ شخص اُس کے سالے کا بیٹا اُس کو جو چاہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب اُدھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اُس کو لکھنا لغو بلکہ مضر ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۹ء

(۵۶) میری جان، آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں او تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلالوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں (رامپور) کی ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا، نہ رہوں گا۔ زنہار نہ رہوں گا۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء　　غالب

(۵۷) مرزا تفتہ، ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہوگا۔ میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا، بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا، اب کہتے ہیں کہ ماہ آئندہ یعنے مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء　　غالب

(۶۰) برخوردار میرزا تفتہ، دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا، تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دوبار بطریق ششماہہ فصل بفصل پایا کریں، ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تا رامپور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ دس گیارہ برس سے اس نگنا میں رہتا تھا، سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا، اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں

اٹھوں۔ بے دردوں نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی، وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس
گز کا طول، اس میں باڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، باڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا
کہ یہ کٹہرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ ۹ جولائی کو دوپہر
کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا، وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی، یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے
بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلہ میں جا رہتا تو
قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے یعنی اب اکثر خطوط لال کنوئیں کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف
یہیں پہنچتے ہیں۔ بہرحال تم وہی دلی بلی ماروں کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔

صبح جمعہ ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء

(۵۹) میرزا تفتہ۔ اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمہارا ہی کام ہے۔ بھائی تضمین گلستاں چھپوا کر
کیا فائدہ اٹھایا ہے جو انطباع سنبلستاں سے نفع اٹھاؤ گے۔ روپیہ جمع رہنے دو، آمد اچھی چیز ہے
اگرچہ قلیل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دیدو۔ بعد نو مہینے
روپیہ تم کو مل جائے گا، یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر احیاناً ہوا بھی
تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیئے۔ رستخیز بیجا ہو چکا۔ اب ہو تو رستخیز ہو، یعنی قیامت اور اس کا
حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی، اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں
احتمال فتنہ سال آئندہ پر رہا سو بھی موہوم۔ میاں میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں
یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا
قول ہے کہ یہ شخص والی رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا

تو بھی پانچہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا، دو سو روپیہ مہینا کردیا تھا، لفٹنٹ گورنر الٰہ آباد جو رامپور آئے اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کردیا۔ یہ تو سب سُن لیا، اب تم اصل حقیقت سُنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے، اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیے مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بُلاتے رہتے تھے، اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا، وہ سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

غالب　　۳۱ مارچ ۱۸۶۲ء

(۶۰) صاحب تمھارا خط میرٹھ سے آیا مراۃ الصحائف کا تماشا دیکھا۔ سنبلستان کا چھاپا خاتم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمھاری آبرو کا نگہبان رہے، بہت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی۔ اچھی گزری اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا۔ سعدی نے بوستاں سے کیا پھل پایا جو تم سنبلستان سے پاؤ گے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے، لاموجود الا اللہ۔ جناب بھائی صاحب یعنی نواب مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ ہمشیرہ کی پنشن کا جاری ہو جانا بہت خوشی کی بات ہے مگر خوشی سے

تعجب زیادہ ہے کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بروئے کار آوے یعنی آپ کا پنشن بھی واگذاشت ہوجاوے۔ اللہ اللہ اللہ۔

صبح یکشنبہ ۲۰ جنوری

(۶۱) بھائی تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالاخانہ کا جو دالان میرے بیٹھنے، اٹھنے، سونے، جاگنے، جینے، مرنے کا محل اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اوگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیے، مالک کی مرمت کی طرف توجہ نہیں کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا اب نجات ہوئی ہے۔ میں ناتوان بہت ہوگیا ہوں گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ۔

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۲ء

(۶۲) میرزا تفتہ، جو کچھ تم نے لکھا یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال

نام اور تفتہ تخلص ہے، تم ایسی کونسی بات لکھو گے کہ موجبِ ملال ہو۔ رہا غماز کا کہنا اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور تمھاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بکار آمدنی نہیں، خیر کبھی دیکھ لوں گا جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں، میری کاہلی۔ تمہارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا۔ کسی قصیدہ سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظر ان مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں ؎

ضعف نے غالبؔ نکمّا کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا، اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا اس کو دیکھ اصلاح کیا آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوا دیا۔

۲۷ رنومبر ۱۸۶۲ء　　**غالب**

(۶۳) لو صاحب کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔ ۸ رجنوری ماہ و سال حال دوشنبہ کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں

پہنچکر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمار داری اور غمخواری بہت کی۔ کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا، جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیئے گذارہ نہو گا۔ سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزر دیئے دو ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب

غالب

(۶۴) نورچشم غالب از خود رفتہ مرزا تفتہ، خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے نہ دوست بخیل نہ میں کاذب، مگر بقول میر تقی ع اتفاقات ہیں زمانہ کے۔ بہرحال کچھ تدبیر بچاؤ گی اور انشاء اللہ صورت وقوع جلد نظر آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہوا ؎

یا کرم خود نماند در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو، اور خوش رہا کرو

نجات کا طالب

غالب۔ سہ شنبہ ۲۴ر نومبر ۱۸۶۳ء

(۶۵) صاحب عجب تماشا ہے تمھارے کہنے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا۔ سو کل انکا خط آیا اور انھوں نے دستنبو کی رسید لکھی۔ آخر تمھیں نے بھیجا ہو گا، یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا۔ اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات

ہونے پر خط کا لکھنا منحصر رکھا ہے تو وہ بھی ہو چکی ہوگی، مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ
ہوگئے ہو۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگذرا سیکڑوں مطالب و مقاصد بجا ئینگے
اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اس کتاب اور مثنوی کی
رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا؟ بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہوگئے ہو۔ خدا کے واسطے
خفگی کی وجہ لکھو۔ صبح کو میں نے یہ خط روانہ کیا ہے۔ بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ اگر شام تک
تمہارا خط آیا تو خیر ورنہ تمہاری رنجش کا بالکل یقین ہو جائے گا اور بے سبب وجہ نہ معلوم ہونیکے
جی گھبرائے گا۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی سبب ایسا نہیں پاتا۔ خدا کے واسطے خط جلد لکھو اگر خفا
ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔ اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان
گذرا ہے کوئی مطلب تم کو نہ لکھنا چاہیئے مگر ضرورت کو کیا کروں ناچار لکھتا ہوں۔ صاحب مطبع نے
خط کے لفافہ پر لکھا ہے "مرزا نوشہ صاحب غالب للہ" غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے، ڈرتا ہوں
کہ کہیں صفحہ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اردو یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز
چھاپے کی یہ کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام لکھ دیتے۔ تم نے بھی ان کو میرا
نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف ہی وجہ اس واویلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ
دلی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزراء کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ
کے حضور میں کوئی اس نالایق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے مرزا نوشہ صاحب
غالب لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا۔ کھو یا گیا۔ میری محنت رایگاں گئی، گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی
لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں۔

غالب
بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ

(۶۶) تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اُس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اُس میں بے تکلف عمر بسر کرے اس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہ مفرط بطرف شعر و سخن، تمھاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمھاری سخن گستری ہے اُس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے، میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، جو دکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ہندوستانیوں میں کچھ دوست کچھ شاگرد کچھ معشوق وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اُس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بنام چودھری عبدالغفور سرور (مارہرہ)

(۶۷) بندہ پرور آپ کا تفقد نامہ محررہ پندرہ نومبر آج پنجشنبہ کے دن اٹھارہ نومبر کو یہاں پہونچا۔ مارہرہ کا خط دلی چوتھے دن آیا۔ پھر دلی کا خط مارہرہ دیر میں کیوں پہونچتا ہے۔ لو تمہاری خوشی ایکے یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں، مگر مجھ کو اطلاع دیجئے گا کہ یہ کس دن پہونچا۔ اا رمئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا، میں نے اُس دن سے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا ہے۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی، اپنی سرگذشت لکھنا شروع کی، جو سنا گیا وہ بھی ضمیمہ سرگذشت کرتا گیا۔ مگر بطریق لزوم مالایلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم جو دساتیر کی زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جائے اور سوائے اسمائے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم صاحب کی، اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں، جرأت نہ کرسکا کہ آپ کی نذر کروں، اور سیر میں انکو مشترک۔ نذر اُن کی ہے، فیض یابی آپ کے مطالعہ سے .... اب روئے سخن حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف۔ امیدوار ہوں کہ میرے ہم عمر مرشد، ہم فن مخدوم، میری تقصیر معاف کریں۔ اگرچہ تر سٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں۔ عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں۔ با وجود حدت بصر، بسبب نقص فہم کے دستخطی عبارت مجھ سے پڑھی نہیں جاتی۔ آگے جو دوبارہ میں نے جواب لکھا ہے صرف قرائن ملحوظ رکھے ہیں، ورنہ عبارت باستیفا مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ آخر چودھری صاحب تو آپ کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے ہیں جو آپ

فرمایا کریں، وہ انھیں الفاظ کو لکھ دیا کریں۔ اب سب عبارت کا جواب جب لکھوں گا کہ کتاب کی رسید اور اس مطلب کا اعادہ تحریر بدستخط چودھری صاحب میرے پاس آجائے گا۔ زیادہ حدادب

....

(۶۸) جناب چودھری صاحب آپ کا عنایت نامہ اِس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے۔ دن بدھ کا، ربیع الثانی کی چوبیسویں اور دسمبر کی پہلی۔ کتاب کے پارسل کی رسید معلوم ہوئی....

آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو کچھ لکھیں وہ بقلم چودھری صاحب لکھا جائے۔ حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بہ دستخط خاص لکھی۔ واللہ باللہ نہ مجھ سے نہ اور کسی سے پڑھی گئی۔ ناچار آپ کا خط آپ کو بھیجتا ہوں۔ حضرت سے کچھ نہ فرمائیے گا، مگر اس عبارت کو اپنے ہاتھ سے نقل کرکے مجھ کو بھجوائیے گا۔ ضرور اور جلد۔ مکرم جناب چودھری صاحب غلام رسول کی خدمت میں سلام پہنچے..........

(۶۹) ....اب خطاب جناب حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ پیرومرشد قلم کا کام زبان سے لینا، یعنی تحریر کے مطالب کو پڑھنا اور پڑھا دینا آسان ہے، اور زبان کا کام قلم سے لینا دشوار ہے۔ یعنی جو کچھ کہا چاہیے اُس کو کیونکر لکھا چاہیے۔ وہ بات کہاں کہ کچھ میں نے عرض کیا، کچھ آپ نے فرمایا، دو چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر دولت ہمزبانی کہاں میسر۔ آپ کے حکم بجالانے کو اپنا شرف جانتا ہوں..........

(۷۰) جناب چودھری صاحب آپ کو بعد ابلاغ سلام آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں، اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں۔ میں

نہیں آسکا۔ یہاں پنشن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں تو یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں، یا کس وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا، مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں۔ للہ الحمد کہ گنہگار نہیں ٹھیرا، پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولیٹکل کے سررشتہ سے مقرر کی ہوئی ہے۔ سو دہلی کا ایجنٹی دفتر فرد فرد لٹ گیا، کوئی کاغذ باقی نہیں رہا، اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں صدر ٹھہرا، اس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا، نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں۔ کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے، مصرعہ کار ہا آساں شود اما بہ صبر

یہاں سے روئے سخن صاحب عالم صاحب کی طرف ہے، جناب رفعت مآب مولائی و مرشدی تسلیم قبول کریں، اور اس تحریر سے، جو آپ میرے پاس بھیجی ہے، مجھ کو شاداں اور اپنے بخت اور قسمت پر نازاں تصور فرماویں۔ سب سمجھا اور سب مطالب کا جواب لکھتا ہوں۔۔

....

(۱۷) جناب عالی آج آپ کا تفقد نامہ مرقومہ یازدہم شعبان مطابق پنجم مارچ بقید روز دوشنبہ پہنچا تو ان تاریخوں کے حساب کے تطابق میں، میں الجھا، پھر خط کے جلد پہنچنے سے بہت خوش ہوا۔ ڈاک کیا ہے خاک ہے، خیر اِدھر پڑھا اُدھر لکھا۔ خدا کرے یہ میرا خط جلد پہنچے، ورنہ یہ آپ کا خیال ہوگا کہ غالب نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ حقیقت میری مجملاً

یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکامِ عالیمقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ دستنبو بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعرِ تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آ گیا۔ ....

پنشن مجھے ابھی تک نہیں ملی جب ملیگی حضرت کو اطلاع دی جائے گی۔ پیر و مرشد عالم ہیں اور میں جاہل ہوں، ان کے تسلیم نہ کرنے کو میں نے تسلیم کیا اور پھر تسلیم بجا لایا۔ حضرت جناب مخدوم مکرم چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں انھیں الفاظ میں مبارکباد ادا کی گئی تھی، نہ طبع آزمائی۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ خط بھی مئی و جون میں آپ کو پہنچ جائے گا۔ آپ کا بھی نو مارچ کا خط مجھ کو آخر اپریل میں پہنچا ہے۔ جناب شیخ صاحب کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں۔ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ افادہ مشترک ہے ....

فیض علی خاں صاحب کو میرا سلام پہنچے، میں بھی آپ کی ملاقات کا مشتاق اور آپ کا مداح رہوں گا۔ خط کا لفافہ اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ یہ آج پہنچا اور آج ہی میں نے اس کا جواب لکھا۔ کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے۔

(۴۷) جناب چودھری صاحب کی یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں، آپ کا خط مع قصیدہ و مثنوی پہنچا۔ مثنوی کو جدا اگانہ بہ طریق پمفلٹ پاکٹ بھیجتا ہوں اور یہ خط جداگانہ ارسال کرتا ہوں، لفافہ اس کا بھی آپ کے نام کا ہے۔ آپ کے خواب کا ماجرا اور صبح کو ادھر کا قصد اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تا بستاں پر اس عزم کا ملتوی رکھنا معلوم ہوا آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی، جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں

میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصولِ اجازت حاکم، احتمال ضرور رکھتا ہے، اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اور اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کے مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے، نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کے جو رائے میں آوے وہ ویسا ہی کرے، بہرحال

اے وائے ز محرومیٔ دیدار دگر ہیچ

انشاء اللہ العظیم دو تین مہینے میں یہاں بھی صورت امن و امان کی ہو جائے گی۔ مگر میری آرزو باستیفا اُس صورت میں بھی نہ بر آئے گی۔ میں تاکے ہوئے ہوں کہ میری اور تمھاری ملاقات اس طرح ہو کہ ہم تم ہوں اور حضرت صاحب عالم صاحب ہوں اور باہم حرف و حکایت کریں اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں، حضرت پیرومرشد کا اشتیاق اور اسی جلسہ میں تمھارے دیدار کا شوق ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو آرام سے بیٹھا رہنے دے گا............

(۴۳) شفیق میرے، عنایت فرما میرے، تمھاری مہربانی کا شکر بجا لاتا ہوں۔ نہایت سعی بھی کہ آپ کی طرف سے ظہور میں آئی۔ میں نے کلکتہ میں مہتمم مطبع بنام بہاں نما کو لکھ بھیجا ہے اور ترک سعی کیا ہے، آپ بھی فکر نہ کیجیے اگر کہیں سے آپ کے پاس آجائے تو مجھ کو بھیج دیجیے میرے پاس آئے گا تو میں تم کو اطلاع دوں گا............

......پیرومرشد کو ہم پر خفا کر دیا۔ بھلا وہ خط لکھیں نہ لکھیں کبھی تم کو تو فرما دیں کہ غالب کو بری دعا لکھ بھیجنا، بہرحال سلام نیاز عرض کیجیے اور ان کے مزاج مبارک کی خیر و عافیت

لکھئے اور یہ بھی لکھئے کہ خدانخواستہ وہ مجھ سے ناخوش ہیں تو ناخوشی کی وجہ کیا ہے ......

(۷۴) بڑے بازار نامی خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں، صاحبِ امکنہ اور دوکانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا، اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے، غلہ گراں، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے ....

حضرت رفعات درجت جناب صاحب عالم کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی بانکسارِ تمام عرض کرتا ہوں۔ حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے۔ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا، یا کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روزِ روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدمبوسی کی تمنا اور انور الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے، اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لیجاؤں گا........

لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے۔ میں دنیادار نہیں، فقیرِ خاکسار ہوں، تواضع میری خُو ہے، انجاحِ مقاصدِ خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہو۔ انشاءاللہ العزیز، وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے ....

(۷۵) .... روئے سخن اب حضرت صاحب عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے۔ میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اُس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکار حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیئے، مگر تین ہزار سال۔ اس میں سے میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال۔

یں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر بمرگِ ناگاہ مرگئے، بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ اُنکے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس کے بعد مرگئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپیہ سال مقرر ہوئے، وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیئے، یعنی اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی۔

اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی، دہلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دیکر بگڑی۔ ایسے مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں، اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدہ کا قصد کروں قصد تو کر سکتا ہوں تمام کون کرے گا، سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس، پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی، کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران ہوتا ہوں کہ میں نے یہ نثر کیونکر لکھی تھی اور کیونکر یہ شعر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے۔ مصرعہ

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپیہ رامپور کے، ساٹھ روپیہ پنشن کے، روٹی کھانے کو بہت ہیں، گرانی اور ارزانی امورِ عامہ سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں، قافلے

کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، ماہ گذشتہ میں گذر گئے مجھ میں قصیدہ کے لکھنے کی قدرت کہاں۔ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں آپکے پاس بھیجوں، آپ وکن کو بھیجیں، متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے، پیشگی پر کیا پیش آئے۔ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں جیوں گا انا للہ وانا الیہ راجعون لا الٰہ الا اللہ و لا معبود الا اللہ ولا موجود الا اللہ۔

(۷۶) جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے، آپ نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا اگر پیرومرشد بھی نہ لکھتے تو کیونکر اطلاع پاتا، اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصول صحت کی دعا کیونکر مانگتا۔ کل سے وقتِ خاص میں دعا مانگ رہا ہوں، یقین ہے کہ پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے، ازاں بعد یہ خط پاؤ گے .... پیرومرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند تجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ اُن دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا یوں کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں، اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا، کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا، رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ بین الطعامین میں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اُبھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت میں، مگر دس بارہ اور پیوندی آم اگر بڑے ہوئے تو پانچ، سات۔ بیت

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت　　　جوانی مگو زندگانی گذشت

اس کے واسطے کیا سفر کروں، مگر حضرت کا دیکھنا، اس کے واسطے متحمل سفر ہوں تو جاڑے میں نہ برسات میں۔ مصرعہ　　اے وائے ز محرومیٔ دیدار دگر ہیچ

(۶۷) بندہ پرور! بہت دن کے بعد برسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمھارے دشمن بعارضہ تپ و لرزہ رنجور ہیں، اللہ اللہ ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں، خدا وہ دن دکھائے کہ تمھارا خط تمھارے دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دونی مسرت۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دلِ سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جنابِ ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا .... جناب چودھری صاحب! آؤ ہم تم حضرت صاحبِ عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں اُن کے کف پائے مبارک سے ملیں، میں سلام کروں گا۔ تم معرف ہو تا کہ غالب یہی ہے اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے، میں نے عزم قدمبوسی کیا، پیر و مرشد نے مجھے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ غالب تو اچھا ہے؟ عرض کرتا ہوں کہ الحمد للہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے۔ ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ جناب یہ اُن کی خوبیاں ہیں، میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے، ضعف قویٰ و اضمحلال کہتے تا کہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا، انکی غمخواری اور درد نوازی کا دم بھرتا۔ شعر　در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن ۔ اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا ڈھنگ نکالا، بوستانِ خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی

طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے زمین پر سے دانہ اٹھاؤں۔ حضرت مسیح تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پھر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ اور کبریٰ دلنشیں ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے ہیہات شعر

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اجی حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے، کاغذ باقی نہیں رہا۔ اپنے سب بھائیوں کو معہ وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجے گا۔

(۷۸) آہاہا جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے، صاحب یہ تو سیاحِ گیتی نوردثانی مخدوم جہانیان جہاں گرد ہیں۔ بہرحال آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے، کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی۔ نظم میں وہ پایۂ بلند کہ شعریٰ ان کے شعر پر لآلی انجم نثار کرے، خود بلا گرداں ہو لولی سما ہر مصرعہ پر دل و جان وارے، ....

چند سطریں میں نے بہزار دشواری لکھ کر تمھیں بھیجی تھیں، خواہش یہ تھی کہ یہی سطریں میرے مخدوم اور مخدوم زادہ کی نظر سے گذر جائیں۔ آج ایک خط میں نے پیرومرشد کا اور پایا وہ ابھی نہیں پڑھا، مگر شاہ عالم صاحب اس کے پشت پر لکھتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں لکھا حالانکہ میں ان سطروں میں لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت نہ اصلاح کے ہوش، ایک بات کو دس دس بار کیا لکھوں۔ اب میرا انجام کار دو طرح پر متصور ہے، یا صحت یا مرگ۔ پہلی صورت میں

خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سن لیں گے۔ یہ سطریں لیٹے لیٹے لکھی ہیں۔

بنام شاہ عالم صاحب (مارہرہ)

(۷۹) مخدوم زادہ والا تبار حضرت شاہ عالم، دعا درویشانہ قبول فرمائیں۔ آپ کا مع الخیر وہاں پہنچنا اور بزرگوں کے قدمبوس اور بھائیوں کے ہم آغوش ہونا آپ کو مبارک ہو۔ مصرعہ

یوسف از مصر بکنعاں آمد

تفرقۂ اوقات سفر اور شدت نمود مقتضی اس کی ہوئی کہ ہنوز تمہارے مسودات نہیں دیکھے گئے تا نزول باران رحمت الٰہی اور بھی چپکے بیٹھے رہو۔ اپنے ماموں صاحب کو نیاز معتقدانہ اور اپنے بھائیوں کو سلام مخلصانہ کہیے گا اور اپنے والد ماجد یعنی میرے مرشد ہم عمر و ہم فن کو سلام جس سے محبت ٹپکے اور اشتیاق برسے، پہنچائیے گا اور عرض کیجیے گا کہ آرزوئے دیدار حد سے گذر گئی۔ یا رب جب تک حضرت صاحب عالم کو مارہرہ میں اور انور الدولہ کو کالپی میں نہ دیکھ لوں اور ان سے ہمکلام نہ ہولوں، میری روح کے قبض کا حکم نہ ہو لیکن ۱۲۷۷ھ میں دو مہینے باقی ہیں اب کی محرم سے اس ذی الحجہ تک میرا مدعا حاصل ہو جائے۔ مشفقی مکرمی چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام شوق کہیے گا اور پیام پہنچائیے گا۔ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے ع خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں۔ ان کے اس خط کا جواب جو مجھے پرسوں پہنچا ہے موم جامہ میں لپیٹ کر پہنچے گا۔ انشاءاللہ العزیز

ہاں جناب شاہ عالم صاحب پھر روئے سخن آپ کی طرف ہے۔ جناب میر وزیر علی خاں صاحب بلگرامی یہاں تشریف لائے اور میرے مسکن سے ایک تیر پرتاب کے فاصلہ پر چاندنی چوک میں حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اترے ہیں۔ ایک دن فقیر بھی اُن کے مکان پر چلا گیا تھا، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ آنکھیں، ان کے حسن وصورت سے روشن ہوگئیں اور دل ان کے حسنِ سیرت سے خوش ہوگیا۔ واہ خاکِ پاکِ بلگرام میں نے وہاں کے جس بزرگ کو دیکھا بہت اچھا پایا۔

بنام صاحب عالم صاحب (مارہرہ)

(۸۰) بعد حمد خدا و نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پہلے قبلہ روح رواں صاحب عالم صاحب کو بندگی اور حضرت مقبول عالم کی شادی کی مبارکباد۔ کیا عرض کروں کہ میرا کیا حال ہے، اضمحلالِ قویٰ کا حال مختصر یہ ہے کہ اگر کوئی دوست ایسا کہ جس سے تکلف کی ملاقات ہے آجائے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں، آج دوپہر کو میر عبدالعزیز صاحب آئے۔ میں بے کلاہ و پیراہن پلنگ پر لیٹا ہوا تھا ان کو دیکھ کر اٹھا، مصافحہ کیا۔ انھوں نے جناب شاہ عالم کا خط مع مسودات اشعار دیا اور فرمایا کہ پرسوں جاؤں گا۔ عرض کیا گیا کہ کل آخر روز تشریف لاویں، خط کا جواب اور اصلاحی مسودہ لیجائیں، وہ تشریف لے گئے میں لیٹا رہا۔ دن کے سونے کی عادت نہیں ہے، جی میں آیا آؤ لیٹے کارکیوں رہو، خط کا جواب لکھ رکھو۔ اُٹھے کون، بکس کھولے کون۔ لڑکوں کی دوات قلم

مونڈھے پر پلنگ کے پاس رکھ لی۔ ادب مقتضی اس کا ہوا کہ آغاز نامہ بنام اقدس ہو........

.......حضرت سید عالم کو نیاز، خورشید عالم کو سلام۔ چودھری صاحب کو نہ نیاز نہ سلام صرف یہ پیام کہ ہم تمھارے خط کو مفرح روح سمجھتے تھے، باتوں کا مزا ملتا تھا، خیر و عافیت معلوم ہوجاتی تھی، وہ وظیفہ روحانی منقطع کیوں ہوا۔ صاحب یہ روش اچھی نہیں، گاہ گاہ ارسال رسائل کا طور بنا رہے۔

(۸۱) پیر و مرشد اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اُس کا شکر کیوں کر بجالاؤں۔ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان درگاہ سے بھلا کہواتا ہے۔ ظاہراً میری تقدیر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عالم میں جیتا بچ رہا۔ اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی وجود کو بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں، واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا ورنہ بندہ دعوئے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا.............

بنام نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق (رئیس کالپی)

(۸۲) قبلۂ حاجات، قصیدہ دوبارہ پہنچا۔ پیشانی پر دستخط کی جگہ نہ تھی، ناچار اُس کو ایک اور دو ورقے پر لکھوایا اور حضور میں گذرانا اور اپنی تمنائے دیرینہ حاصل کی یعنی دستخط خاص مشتمل اظہار خوشنودی طبع اقدس پیہ ہو گی۔ احترام الدولہ بہادر میرے ہم زبان اور آپ کے ثناخواں ہیں، گویا اس امر خاص میں وہ شریک غالب ہیں۔ ہم بطریق کسرۂ اضافی اور ہم بہ سبیل

کسرۂ توصیفی، پروردگار اس بزرگوار کو سلامت رکھے۔ قدردانِ کمال بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے .... میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کسقدر آرزومند ہوں۔ میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار خاں بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر زادہ بھی تھا۔ میں نے اپنی چچی اور اُس نے اپنی پھوپی کا دودھ پیا تھا، وہ باعث ہوا تھا میرے پانڈا بوندیل کھنڈ آنے کا، میں نے سب سامان سفر کر لیا ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے یہاں کی سواری میں باندے جا کر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بہ سبیل ڈاک دلی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا بیمار ہو گئے اور مرض نے طول کھینچا، وہ ارادہ قوۃ سے فعل میں نہ آیا، اور پھر مرزا اور نگ خاں میرا بھائی مر گیا مصرعہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

واللہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا مگر میں نتیجہ اس شکل کا آپ کے دیدار کو سمجھا ہوا تھا ہرزہ سرائی کا جرم معاف کیجیئے گا۔ میرا جی آپ کے ساتھ باتیں کرنے کو چاہا اسواسطے جو دل میں تھا وہ اس عبارت سے زباں پر لایا۔

(۸۳) پیر و مرشد حضور کا توقیع خاص اور آپ کا نوازش نامہ، یہ دونوں حرزِ بازو ایک دن ایک وقت پہنچے۔ توقیع کا جواب دو چار دن میں لکھوں گا۔ ناسازی مزاج مبارک موجب تشویش و ملال ہوئی، اگرچہ حضرت کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مرض باقی نہیں، مگر ضعف۔ لیکن تسکینِ خاطر منحصر اس میں ہے کہ آپ بعد اس تحریر کے ملاحظہ فرمانے کے، اپنے مزاج کا حال

پھر لکھیں .... ساہوکار سے کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں تو مناسب ہے صہبائی کے تذکرہ کی ایک جلد میری ملک میں سے میرے پاس تھی وہ میں اپنی طرف سے بہ سبیل ارمغاں آپ کو بھیجتا ہوں، نذر قبول ہو۔ اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ لکھ کر رکھ دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔ بارہ پر دو بجے کتاب کا پارسل بطریق بیرنگ روانہ کروں گا...

....

(۸۴) پیر و مرشد، آداب، مزاج مقدس۔ میرا جو حال آپ نے پوچھا اس پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آپ کا بندۂ بے درم خریدہ اچھی طرح ہے .... بارے آفتاب عقرب میں آگیا، پانی برف آب ہو گیا ہے۔ کابل و کشمیر کا میوہ بکنے لگا ہے۔ یہ ضعف ضعفِ قسمت تو نہیں کہ ایسے ایسے امور اس کو زائل نہ کر سکیں۔ غزلوں کو پرسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے، جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے وہ مجھ سے سن لیجئے .... یہ جو آپ اپنے کلام کے حک و اصلاح کے واسطے مجھ سے فرماتے ہیں یہ آپ میری آبرو بڑھاتے ہیں۔ کوئی بات بیجا ہو یا کوئی لفظ ناروا ہو تو میں حکم بجالاؤں۔ زیادہ حدِ ادب

(۸۵) کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے، قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب نہ آداب نہ بندگی نہ تسلیم، سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ بن اے ایاز حد خود بشناس مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد رات کو نو (۹) بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد

کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھو، پھر بندگی عرض کرو، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خیر پوچھو۔ عنایت نامہ کے آنے کا شکر ادا کرو اور یہ کہو کر کہ جو میں تصور کر رہا تھا وہ ہوا۔ یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا اُسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی، موسم اچھا آ گیا ہے۔ ....

(۸۶) پیرومرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔ خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ آج شہر میں بدرالدین علی خاں کا نظیر نہیں۔ مُہر اور کون کھود سکیگا، ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ جو میرے نام تھا وہ اُن کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے رقعہ میرے نام آج بھیجا، سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قسم دوم نکھراج کی کیا ہے۔ آپ اُس کو سمجھ لیں اور نگیں باحتیاط ارسال فرما دیں، روپیہ کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، جب میں عرض کروں تب بھیجئے گا۔ ....

(۸۷) حضرت پیرومرشد! اگر آج میرے سب دوست اور عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے تو میں کہتا کہ آؤ اور رسم تہنیت بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انوارالدولہ کا خط لایا۔ مصرعہ: این کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب
منھ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انوارالدولہ سے مل کر سرگذشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔ روپیہ کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جاں گزا ہے پر بموجب تلف المال خلف العمر عمر فزا ہے جو روپیہ ہاتھ سے گیا ہے اس کو عمر کی قیمت جانئے اور ثباتِ ذات و بقائے عرض و ناموس کو غنیمت

جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جناب میر احمد علی صاحب کا جواب کے خط میں ذکر نہیں آیا ہے تو اس خیر خواہ احباب کا دل گھبرایا ہے۔

(۸۸) پیر و مرشد شبِ رفتہ کو مینھ خوب برسا، ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہوگیا۔ اب صبح کا وقت ہے، ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے میں عالمِ تصور میں آپ کو مسندِ عز و جاہ پر جا نشیں اور منشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش بجا لاتا ہوں اور منشی صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ کافرِ نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجا نہ لاؤں۔ حضرت نے اور منشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت اٹھائی ہے بھائی صاحب بہت خوشنود ہوئے۔ منت پذیری میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بتوسط میرے سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ نامہ جداگانہ بھی ارسال کریں۔ حضرت آپ غالب کی تحریر نہیں دیکھتے ہیں، سب کچھ لکھے جاتا ہے اور اس اصل کا جس پر یہ مراتب متفرع ہوں فکر نہیں کرتا۔ فقیر کو تو یہ طرز پسند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو متقدر چھوڑ جانا کیا شیوہ ہے، یوں لکھنا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ اور اس کے ساتھ نسب نامہ خاندان مجد و علا کا پارسل پہنچا۔ میں ممنون ہوا۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر بہت ممنون و شاکر ہوئے۔ جناب عالی ہیں تو غالب ہرزہ سرا کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اس کو مصاحب بنا رکھا ہے۔ اس سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ قبلہ و کعبہ جناب مولانا فلق میں حضرت شفق سے جو غالب کی شفاعت کی تھی وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جنابِ ہاشمی کو اپنا ہم زبان اور مددگار بنا کر پھر کہتے ہیں۔ آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا جب تک سید صاحب کا خوشنودی نامہ نہ بھجوائیے گا۔ اس سارٹیفکٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی میں موجود ہوں۔ والسلام

(۷۹) پیر و مرشد کورنش، مزاج اقدس الحمد للہ۔ تو اچھا ہے حضرت دعا کرتا ہوں۔ پرسوں آپکا خط مع سارٹیفکٹ کے پہنچا۔ آپ کو مبدأ فیاض سے اشرف الوکلا خطاب ملا۔ مجتبانہ ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیئے، ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ یا ڈھماک داس۔ میں بالاخانے پر رہتا ہوں حویلی میں آکر اس نے دار وغہ کو خط دے کر . . . . . . مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارکباد ہو آپ کو جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے، سرنامہ کو غور سے دیکھا کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشاں لکھا تھا، اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے کیشاں کو کپتان پڑھا۔

بنام میر مہدی حسین مجروح (پانی پت)

(۹۰) برخوردار تمہارا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کرلوں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور اس کو میں میر سرفراز حسین کے مقدمہ میں لکھ لوں تو اس وقت تمہارے خط کا جواب لکھوں، چونکہ آج تک انکا خط نہ آیا۔ میں سوچا کہ اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہوگا ناچار جو کچھ الور کا حال سُنا ہے، وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں . . . . مولانا غالب علیہ الرحمتہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب، امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد

بوستانِ خیال کی آ گئی ہے ستر ہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں بیت

کسے کایں مرادش میسر بود　　　اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین صاحب کو دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں

(۹۱) اہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہیں وہ اور کہاں ہے پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے، خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست، نہ عرف لکھنے کی حاجت نہ محلہ کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیجدیا کیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں کا حال ہر طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

(۹۲) اے جناب میرن صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں، میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے

خفا کیا ہوں گے۔ بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم نے مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔
سبحان اللہ! اے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم
باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں
سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو
نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن کے
بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو! ہوش کی خبر لو تمھارے جانے سے نہ جانے سے مجھے
کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا
لاحول ولاقوۃ۔ سنو میر مہدی صاحب میرا کچھ گناہ نہیں۔ یہ میرے خط کا جواب لکھو تپ تو رفع ہوگئی
...... پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز
اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا..............

(۹۴) آؤ میاں سید زادۂ آزادو دلی کے عاشقِ دل دادہ۔ ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے
حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہرو آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں
ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ خود بےخود و مدہوش
نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے پر تتاپانی۔ ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔ سنو صاحب
پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں، احمد حسین خاں ولد سردار خاں ولد دلاور خاں اور نانا
اس کا احمد حسین خاں ولد غلام حسین خان ولد سردار خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور
مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے، معاش کیا ہے، طریق کیا ہے۔ احمد حسین خاں کی عمر کیا ہے، لیاقت ذاتی

کا کیا رنگ ہے، طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے بھائی لکھ اور جلد لکھ۔

(۹۴)　سید خدا کی پناہ، عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو سر پر اٹھایا ہے، ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سرمایۂ آرایشِ گفتار بہم پہنچا ہے، میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔ بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے سمجھ میں کسی کی نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوایل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوئی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینہ میں برابر وہی صورت رہی ہے، آج ۲۷ مارچ کی ہے، پانچ چار دن مہینہ کے باقی ہیں، آج ویسی ہی تیز ہے خدا اپنے بندوں پر رحم کرے ....

(۹۵)　برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو۔ بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا، تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آئے، کیا تپ ابن ہنکر آئی تھی جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے، حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمھاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔ سنو میاں سرفراز حسین ہزار برس میں تم نے ایک خط مجھ کو لکھا وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے مصرعہ بغیر در شکر آبست رو بماداد، پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈھتا ہوں کہ میرے واسطے کونسی بات ہے، مجھ کو کیا پیام ہے، کچھ نہیں، شاید دوسرے صفحہ میں کچھ ہو، اُدھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا، یہ کیا بھید ہے، میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں، میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے

اُس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور اُن کے لئے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اُس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۹۶) میاں کس حال میں ہو کس خیال میں ہو کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں انکی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورتِ دیوار چُپ۔ جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چُپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی، ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپیہ خرچ راہ دیئے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپیہ ظاہر کریں گے، اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تو وہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے، بھائی میں دلی سے آیا ہوں، قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔ زنہار نہ باور کیجیئے، مالِ غنیمت سمجھ کر لے لیجو کون گیا ہے کون آیا ہے۔ کلو آیا ز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں، ان تینوں میں اُسے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک انکو پہنچا گئے رسم متابعت

عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون برا اور کون اچھا ہے۔ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے، یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقہ جاتی ہیں مرد پیار کرتے ہیں............

(۹۷) واہ واہ سید صاحب تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے مگر حیران ہوں کہ سحر سازی کروں یا سخن پردازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو، اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رود نیل یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں لو سنو اب تمہاری ولی کی باتیں ہیں........ میری جان سرافراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو اب صورت کیا ہے اور آئندہ عزیمت کیا ہے.......... میرن صاحب کہاں ہیں کوئی جائے اور بلا لائے، حضرت آئیے السلام علیکم مزاج مبارک۔ کہیے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں، اگر بھیجا ہے تو کیا لکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں میں کہیں تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیونکر تم سے بے ادبیاں کر سکتے، انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیونکر ایک جا ہوں گے، دیکھیے زمانہ اور کیا دکھائے گا اللہ اللہ اللہ۔

(۹۸) کیوں یار کیا کہتے ہو، ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں۔ تمہارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر

پڑھا۔ شعر وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیجکر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیگا نہیں، میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی اچھی حکمت کی، کیا وہ میرے باپ کے نوکر تھے کہ میں ان کو بلاتا۔ انھیں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں میں حاضر ہوتا ہوں، دو گھڑی کے بعد وہ آئے اِدھر کی بات اُدھر کی بات کوئی انگریزی کاغذ دکھایا کوئی فارسی خط پڑھوایا۔ اجی کیوں حضرت آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے صاحب میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ، اور ایک مقام کا پتہ لکھا ہے کہ وہاں ٹھیر کر مجھے اطلاع کرو میں شہر میں بلا لوں گا۔ صاحب اب وہ ضرور آئیں گے آخر کار ان سے اجازت لیکر اب تم کو لکھتا ہوں کہ ان سے مختصر کلمہ کہدو کہ بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا آئندہ خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس جب ایک چیز کھانے کو ہوئی تو پھر کیا غم ہے میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا، میر نصیر الدین کو دعا اور شفیع احمد کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا، میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا یہ خط پڑھا دو اور ادھر کو روانہ کردو۔ کیا خوب بات یاد آئی ہے کیوں وہ شہر سے باہر ٹھیرے ہیں اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں۔ شکرم میں کرانچی میں چڑھ بیٹھیں یعنی ڈاک میں آئیں، بلی ماراں کے محلے میں میرے مکان پر اتر پڑیں مرزا قربان علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں، میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان ہے۔ ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا، صلاح تو ایسی ہے اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو

عید بھی یہیں کریں۔

(۹۹) برخوردار کامگار میر مہدی، قطعہ تم نے دیکھا، سچ سچ میرا حلیہ ہے۔ وہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں بھیجنے کے واسطے لکھا ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے بتایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں؟ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ، ٹکٹ لگا، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالہ کر، گھر میں چلا گیا، اور وہاں ایک چھیڑ یہ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو بھی تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ لو اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہوں کیا لکھوں۔ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سن لیا ہو گا مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہو گا بے اصل باتیں ہیں......... یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آ گئے، دن بھی تھوڑا رہ گیا، میں نے بکس بند کیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا، شام ہوئی، چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں، میں پلنگ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ناگاہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین سید نصیر الدین آیا، ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اُس کے سر پر ایک ٹوکرا، اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا آہا ہا ہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے، فیض خاص نہیں لطف عام ہے، شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربہ مہر گلاس سمجھا، لگور سے بھرا ہوا، اگر وہ کس حکمت سے بھرا ہوا ہے کہ منہ گلاس میں سے ایک قطرہ گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسی تھے، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے تا اُن کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیئے۔ میں نے کہا بھائی

یہ کیا کم ہے مگر میں تمھاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے، خانہ آباد و دولت زیادہ ....

(۱۰۰) میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں، اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو بحل کیا اللہ برکت دے .... ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے، حکم تو اسی حکم کے ساتھ رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو اب دیکھئے۔ یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں حاکم پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب مجھ سے بھی کہہ کر منگائی اور میں نے دی اب دیکھوں حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا، دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں، میر سرفراز حسین صاحب، میر نصیر الدین کو دعا۔

(۱۰۱) مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ملک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے، ایک گوشہ و توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔ شعر

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک ۔۔۔ اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے، کل سے مجھ کو بیکس بہت یاد آتا ہے۔ سو صاحب اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں۔ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی۔ مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو، آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں، دیکھو کیسا لکھتا ہوں۔ پنشن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال نہیں معلوم "دیر آید درست آید"۔ بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت نہ مجھ کو تہنیت، بلکہ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے، "اچھلتے کودتے، پھرتے ہیں"۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے کیا غضب ہوا یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آتیں تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا، بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں ؎

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں   دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

یہ تقی کا مقطع یوں ہے:

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں   اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں، اندر باہر سب روزہ دار ہیں یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علیخاں جس کا روزمرہ ہے "کھلونے منگا دو میں بھی بجار جاؤں گا"۔ میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سنا دینا برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

بنام میر سرفراز حسین صاحب (پانی پت)

(۱۰۲) میری جان کے چین مجتہد العصر میر سرفراز حسین، تم کو اور تمھارے بھائی اور تمھارے دوست کو دعا۔ پھر یہ بیان کہ غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد غدر دربار اور خلعت اور ملاقات سکرٹروں کی یہ سب موقوف۔ اب جو لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب آئے تو انھوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے از راہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں کا بھی دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالے نہ جا سکا۔ بالفعل نائب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اُس خلعت کو بشرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا......
آج جمعہ ساتویں شوال کی اور ستائیسویں مارچ کی ہے۔ چار گھڑی دن چڑھا ہے، میں یہ خط لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تم بھی پڑھو اور میر مہدی کو بھی پڑھا دو۔ اب شاید تھوڑے دنوں تک میں خط نہ لکھ سکوں۔ تفصیل اس کی یہ کہ رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہوگئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہوگیا۔ اب بقدر ایک کف دست وہ گوشت مردار ہوگیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ دو ہفتے سے انگریزی علاج ہوتا ہے، کالا ڈاکٹر روز آتا ہے۔ آج اس نے ارادہ اس مردار گوشت کے کاٹنے کا کیا ہے۔ اب وہ آتا ہوگا۔ میں جلد جلد یہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں تاکہ پھر ہاتھ کے پرزے اڑا دوں۔ نجات کا طالب

غالب

(۱۰۳) نورِ چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو اور خوش ہو۔ تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا

جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں توانا ہیں یا ناتوان ہیں بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہرحال غنیمت ہیں۔ کوئی بھلا کہتا ہے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے وہ یوسف علیخاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنتے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئیگا۔ سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے اگر بھول نہ جائیں گے پہنچائیں گے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے صاحب ابن نہیں ہے نہ ہو۔ غلام اشرف نہیں ہے نہ ہو۔ اگر منظور کیجیئے تو میں صوفی ہوں ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں بموجب مصرع کے ع "دل بدست آور کہ حج اکبر است" تم سے کب انکار کرتا ہوں۔ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو تو خوش اگر غلام اشرف جانو تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ، دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلد آؤ .... میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی۔ بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے، اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے دعا سلام کی کیا حاجت۔ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔

بنام مولوی عبدالغفور خاں بہادر نسّاخ

(۱۰۴) جناب مولوی صاحب قبلۂ یہ درویش گوشہ نشیں جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے مکرمتِ حال کا شکر گذار اور آئندہ افزائش عنایت کا طالب ہے۔ دفترِ بے مثال کو عطیہ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچ میرز ہیچ مداں کو قابلِ خطاب اور لائق عطائے کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم با مسمّیٰ ہے دفترِ بے مثال اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین معانی بلند مضمون عمدہ بندش دلپسند۔ ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے آپ اُن سے بڑھ کر بے شبہہ بے مبالغہ نسّاخ ہیں۔ تم دانائے رموزِ اردو زبان ہو سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو۔

خاکسار نے ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید .... ایک کم ستر برس دنیا میں رہا اب اور کہاں تک رہوں گا ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا تین رسالے نثر کے یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں

ساری عمر گنوائی۔ .... سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے اسی سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ اسی قدر ہے کہ معرضِ گفتار میں موافق سوال جواب دیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیونکر بخشا جاتا ہے۔ .... جب تک میں جیتا رہوں نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے مرنے کے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیئے گا۔ والسلام بالوف الاحترام۔

بنام قاضی عبدالجمیل صاحب

(۱۰۵) مخدوم مکرم و معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغ سلام مسنون الاسلام کے عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کی ارادت میرا ذریعہ فخر و سعادت ہے۔ دو عنایت نامے آپ کے اوقاتِ مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیہ اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حرف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور میں عینک کا محتاج نہیں لیکن بااین ہمہ اُس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اسکے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دی جائے۔ واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجئے اس میں بین الاسطر اور بین المصرعین فاصلہ زیادہ چھوڑ دیجئے۔ آپ کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے، حروف اسکے روشن ہیں

مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھاتا ہوں اور ان دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا اس سے مقابلہ کر کے معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔ مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں، وہاں کے مصرع طرحی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو، اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔ والسلام مع الاکرام۔

(۱۰۶) قبلہ آپ کو خط بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے۔ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے اور مجھ کو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔۔۔۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا جو آپ نے بھیجا وہ مجھ کو پہنچا۔ بات یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں۔ میں نے آئینِ نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔ اب کے آپ کے خط میں تین مطلب جواب لکھنے کے قابل تھے۔ ایک تو وہ رباعی جو آپ نے اس ننگِ آفرینش کی مدح میں لکھی ہے، اس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب۔ دوسرا مدعا خط کے نہ پہنچنے کا وسوسہ، سو اس کا جواب لکھ چکا۔ تیسرا امر جناب مولوی امتیاز علی خاں کا میرے ہاں آنا اور میرا اس وقت مکان پر موجود نہ ہونا، واللہ مجھ کو بڑا رنج ہوا

اگر آپ سے ملیں تو میرا سلام کہئے گا اور میرا ملال ان سے بیان کیجئے گا سچ کو میں ہر روز قلعہ کو جاتا ہوں۔ ظاہرا مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے۔ جب سوار ہو جاتا ہوں تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے حقہ پیتے۔ اگر قلعہ جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں زیادہ اس سے کیا لکھوں۔

(۱۰۷) پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار کو یا اس دَر کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں۔ ۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ انشاءاللہ حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔ نمایش گاہ بریلی کی سیر کہاں۔ خود اس نمایش گاہ کی سیر میں جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

(۱۰۸) قبلہ! ایک سو بیس آم پہنچے۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے۔ دس قلمیں اور چھٹانک بھر بیاہی کہار کے حوالہ کر دی ہے۔ خدا کرے بحفاظت آپ کے پاس پہنچے۔ میں مریض نہیں ہوں بوڑھا ہوں اور ناتوان گویا نیم جان رہ گیا ہوں۔ ایک کم ستر برس دنیا میں رہا کوئی کام دین کا نہیں کیا۔ افسوس صد ہزار افسوس۔ وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عالم مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔

(۱۰۹) جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدہ کی تہنیت۔ اگر مجھ میں قوت ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی بیمار تو نہیں تندرست ہوں مگر بوڑھا ہوں جو کچھ طاقت باقی تھی وہ اس ابتلا میں زائل ہو گئی

اب ایک جسم بے روح متحرک ہوں ع یکے مردہ شخصم بہ مردی رواں ، اس مہینے یعنی رجب ۱۲۸۰ھ سے
سترواں برس شروع اور اسقام و آلام کا آغاز ہے ۔ لاموجود الا اللہ ۔

(۱۱۰) جناب مولوی صاحب آپ کے دونوں خط پہنچے ۔ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ ۔ آٹھ پہر
پڑا رہتا ہوں ۔ اصل میں صاحب فراش ہوں ، بیس دن سے پاؤں پر ورم ہو گیا ہے ۔ کفِ پا و پشتِ پا
سے نوبت گذر کر پنڈلی تک آماس ہے ۔ جوتی میں پاؤں سماتا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے واسطے
اٹھنا دشوار ۔ یہ سب باتیں یک طرف ۔ دردِ تحلیلِ روح ہے ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب
کے واسطے تھا ۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں ، حیران ہوں کہ کوئی صورت
زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں ۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر
قفس میں ۔ کوئی شغل ، کوئی اختلاط ، کوئی جلسہ ، کوئی مجمع پسند نہیں ۔ کتاب سے نفرت ، شعر سے
نفرت ، جسم سے نفرت ۔ روح سے نفرت ۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے ع
خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ، ایسے مخمصہ میں اگر تحریر جواب میں قاصر رہوں تو معاف
ہوں ۔ مجھے کیوں شرمندہ کیا ۔ میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں ، مگر اچھوں کا شیوہ ہے بروں کو اچھا
کہنا ۔ اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجا لاتا ہوں ۔

(۱۱۱) پیر و مرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر رہا ہے جو حکم آپ کا ہوتا ہے اس کو بجا
لاتا ہوں ، مگر معدوم کو موجود کرنا میرے وسعِ قدرت سے باہر ہے ، اس زمین میں کہ جس کا آپ نے
قافیہ درد دل لکھا ہے میں نے کبھی غزل نہیں لکھی ۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے
کس سے اس زمین کا شعر لے کر میرا کلام گمان کیا ہے ۔ ہر چند میں نے خیال کیا اس زمین میں میری

کوئی غزل نہیں۔ دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے اپنے حافظہ پر اعتماد نہ کرکے اسکو بھی دیکھا وہ غزل نہ نکلی۔ سنیئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں چنانچہ انھیں دنوں میں ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجئے ع اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں' میں نے کہا لاحول ولا قوۃ' اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانہ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اُس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر اور بت اور خدا اور جفا اور وفا میری طرز گفتار نہیں ہے بھلا ان دونوں شعروں میں تو اسد کا لفظ بھی ہے' وہ شعر میرا کیونکر سمجھا گیا۔ واللہ باللہ وہ شعر خدنگ رنگ کے قافیہ کا میرا نہیں۔

بنام مردان علیخاں رعنا

(۱۱۲) خان صاحب عالی شان مردان علیخان صاحب کو فقیر غالب کا سلام۔ نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنو کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں کہ ہتھنی آیا' اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں' ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مونث بے شبہ و شک والسلام مع الاکرام۔

(113) خان صاحب مشفق عالیشان کو میرا سلام۔ کل تمھارا عنایت نامہ پہنچا۔ رامپور کا لفافہ آج رامپور کو روانہ ہوا۔ کاغذ اشعار میں نے دیکھ لیا کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ نالہ در الخ شعر عنا گزرا ہے مرا نالہ در چرخ کہن سے تھا روح کا ہمدم نہ پھرا جا کے وطن سے نالۂ دل بنا دیا۔ نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھیے۔ بید فارسی غزل تم نے بیفائدہ لکھی دیکھو صاحب تم نے اپنے مسکن کا پتا لکھا سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے، مجھ سے ملے۔ بہت خوب صورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمھارے وہ مداح اور میں اُن کا ثنا خواں۔ خدا تم کو اور اُن کو سلامت رکھے۔

بنام مولوی عبدالرزاق شاکر

(114) جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی عبدالرزاق شاکر کی خدمت میں بعد سلام یہ التماس ہے کہ مولوی صاحب عالیشان مولوی مفتی اسد اللہ خاں بہادر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہنچائیے میں تو آپ سے عرض کرتا ہوں مگر آپ مفتی صاحب سے کہیے کہ مجھ کو باوجود شدتِ نسیاں آپ کا تشریف لانا یاد ہے۔ چھاپے کے اجزا اٹھا کر میں نے آپ کے سامنے ایک غزل اپنی پڑھی تھی جس کے دو شعر قطعہ بند یہ ہیں ؎

ار زندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست خود را بخاک رہ گذر حیدر افگنم

منصور فرقۂ علی اللہیاں منم آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم

خدا کرے حضرت کو بھی واقعہ یاد ہو۔ اتحاد اسمی دلیل مودت روحانی ہے۔ اخی مکرمی میر قاسم علیخاں کو

لام پہنچے۔ سال گذشتہ کی تعطیل کی طرح دلی آکر مجھ سے بے ملے نہ چلے جایئے گا۔ پھر حضرت مکتوب الیہ
ے کلام ہے، اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچتے ہیں، یہ رتبہ میری ارزش کی فوق ہے کہ میں آپ کے
لام میں دخل و تصرف کروں۔ بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ
ری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارت غریزی کو
وال ہے اور یہ حال ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

چھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں
ن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے ان میں سے
و صاحب الی الآن موجود ہیں، ان سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت
ا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں اور رسالوں اور نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ اور چھاپا ہو کر
طراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرے جو نثریں کہ مجموع و یک جا
ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں انھیں کو جناب احدیت جلت عظمتہ مقبول قلوب
ل سخن و مطبوع طبایع ارباب فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچکر آفتاب لب بام
ور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کی
لمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا، اگر اس نے چاہا تو قیامت
ک میرا نام و نشان باقی و قایم رہیگا۔ پس امیدوار ہوں کہ آپ انھیں نذور محقرہ یعنی تحریرات
روزمرہ اردوئے سادہ و سرسری کو غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دل ریش و

فرو ماندۂ کشاکشِ معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ما سوا ہوس۔

(۱۱۵) قبلہ و کعبہ فقیر پا در رکاب ہے بہ شنبہ چار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رامپور ہو دیگا۔ تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیس حال کی تہنیت، دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں تو رامپور بھیجیں، مکان کا پتہ لکھنا ضرور نہیں شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اٹھاتا ہوں حسن اتفاق سے اصلاح مخمسہ کے وقت دوستِ غمگسار یار وفا شعار علامہ روزگار ختم العلماء المتبحرین مولوی مفتی صدر الدین خاں صاحب بہادر صدر الصدور سابق دہلی المتخلص بہ آزردہ دام بقاؤہ زاد علاوہ مجھ سے ملنے کو غم خانہ پر تشریف لائے ہوئے موجود تھے مخمسہ کو دیکھکر پسند فرمایا حضور کی بلاغت کی تحسین عربی مصرعوں کے میرے ساتھ شریک غالب ہو کر مزے لوٹے اور آپ کی شیرینی گفتار کے وصف میں تا دیر عذب البیان اور رطب اللسان رہے اور مجھ سے بقدر میرے معلوم اور بیان کے آپ کی صفات حمیدہ سے واقف و آگاہ ہو کر بہت شاد و خرسند ہوئے، نادیدہ و غائبانہ یعنی محض مشتاقانہ بہ تمنائے ملاقات سلام لکھنے کو ارشاد کر گئے ہیں لہذا میں لکھتا ہوں قبول فرمائیے گا۔

بنام مولوی عزیز الدین صاحب

(۱۱۶) صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کی پھاٹک تک بے چراغ ہے

ان آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ...... لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں۔ تمھارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی وہ لاہور گئی ہوئی ہے .... قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو۔ آپ اُن سے میرا اسلام نیاز کہیے اور خط کے نہ پہنچنے کی اُن کو خبر پہنچائیے۔

بنام مفتی سیّد محمد عباس صاحب

(۱۱۷) قبلہ حضرت کا نوازش نامہ آیا۔ میں نے اس کو حرزِ بازو بنایا۔ آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عز و افتخار ہے۔ فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی سراسر دیکھا جائے نہ پیشِ نظر دھرا رہے بلکہ اکثر دیکھا جائے۔ میں نے جو نسخہ بھیجا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم ہوں نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد چاہتا ہوں۔ طرزِ عبارت کی داد دیا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبتِ خداداد تربیتِ استاد سے حسن و قبحِ ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ

کی تہذیب کا خیال آیا۔ .... آپ کے علم و فضل و فہم و ادراک کی جو تعریف کی جائے وہ حق ہے لیکن میرے شعر کی تعریف صرف خریداری دکانِ بے رونق ہے۔

بنام عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں صاحب

(۱۱۸) میاں حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں ابھی تک بلایا نہیں گیا۔ معرضِ باز پرس میں نہیں آیا، آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ شیر زماں خاں نے مجھے آگرہ سے خط لکھا، اس میں ایک رقعہ شیخ نجم الدین حیدر صاحب کی طرف سے بنام ظہیر الدین کے۔ اب مجھ کو ضرور آ پڑا کہ اس کو تمھارے پاس بھیجوں۔ آدمی کوئی ایسا نظر نہ چڑھا، ناچار بطریق ڈاک بھیجتا ہوں، اگر پہنچ جائے تو آگرہ کا جواب لکھ کر میرے پاس بھیج دینا، میں یہاں سے آگرہ کو روانہ کر دوں گا۔

مرسلہ دو شنبہ۔ چہارم جمادی الاول ۱۲۷۴ھ۔ جواب طلب غالب

(۱۱۹) میاں تمھارا خط پہنچا۔ آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرہ کو روانہ کیا۔ تم جو کہتے ہو کہ تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا تو اب بھی نہ لکھتے۔ انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں۔ کچھ لکھ سکتا ہوں، کچھ قابل لکھنے کے ہے۔ تمنے جو مجھکو لکھا تو کیا لکھا اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا ظہیر الدین کو دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اور اسکی بہن کو اور اس کی لڑکی کو تمھاری ماں دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے۔ یہ رقعہ حیدر حسین خاں کے نام کا ہے

اُن کو حوالہ کر دینا۔

اسداللہ　نگاشتہ شنبہ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۲۰)　بھائی ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا اور رقعہ میں کب لکھا کہ شیر زماں کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں، میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی وہ ہی بندگی لکھی ہوئی گویا لپٹی ہوئی تھی، سو حضرت کو پہنچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

(۱۲۱)　سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں طال بقاوہٗ۔ تمہارا رقعہ پہنچا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک میں مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نواسی کا حال معلوم ہوا حق تعالیٰ اُس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی تھی۔ تمہاری اُستانی تم کو اور ظہیر الدین کو اور اُس کی ماں کو اور اُس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں۔

غالب　سہ شنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء

(۱۲۲)　جان و جاناں و از جاں عزیز تر حکیم غلام نجف خاں سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ قبلہ یہ تو معلوم ہوا کہ بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ دو اُس میں عزیز بھی تھے، یہ سب وہاں سے نکالے گئے مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکر نکلے۔ پیادہ پا، سوار، تہی دست یا مالدار۔ مستورات کو تو تم نے دیکھیں، ذکور کا حال کیا ہوا اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا۔ کہاں رہے اور کہاں رہیں گے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے

مورد تفقد و ترحم ہیں یا نہیں۔ رنگ کیا نظر آتا ہے۔ خبر کسر کی توقع ہے یا نہیں تفضل حسین خاں کا حال خصوصاً اوران سوالات کا جواب عموماً لکھو۔ میرزا مغل میرا حقیقی بھانجا کہ وہ منشی خلیل الدین خاں مرحوم کا خویش ہے اُس کی بی بی ہے اور شائد ایک یا دو بچے بھی ہیں، اذعانی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلہ کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو اس کا حال بانفراد لکھیے۔ خواجہ جان اور خواجہ امان کی حقیقت بھی بشرط اطلاع ضروری فرمائیے، اور ہاں صاحب آپ جانتے ہوں گے علی محمد خاں کو وہ جو میر منشی عزیز اللہ خاں کا خویش ہے، اگر کچھ اُس کا ذکر بھی سُنا ہو تو میں اس کا خیر طلب ہوں۔

غالب ۔ جواب طلب

(۱۲۴) صاحب کل آخر روز تمھارا خط آیا میں نے پڑھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہوگا، ما کتب فیہ معلوم کیا ہوگا۔ تمھارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا جی گھبراتا ہے، کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے۔ کے برس کے مہینے کے دن راہ دکھاؤ گے۔ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو بدستور ہے ع زمیں سخت ہے آسماں دور ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے، تونگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر اننداد دروازہ آبکاری ہے، اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولوی فضل رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم معلوم کر سکو یا کچھ معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں۔ کیوں ظہیر الدین کیا میں اس

لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا حکیم غلام نجف خاں خط لکھتے بیٹھے تیری بندگی لکھدی۔ تیرے فرشتوں کو خبر نہیں اس بندگی کے آگے آنے کی مجھے کیا خوشی۔

غالب ۔ صبح یکشنبہ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۳ء

(۱۲۴)　حکیم غلام نجف خاں، سنو اگر تم نے مجھے بنایا ہے یعنی استاد اور باپ کہتے ہو یہ امر از روئے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو، اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو اس نے اگر حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی اور وہ تمھارے بھائی بھی ہیں اور تم کو اُن سے استفادہ بھی ہے، اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا تو اُن کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے۔ ابتدا میں اُن سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب سوائے تمھارے اگر گیا تو تمھارے ہی علاقہ میں گیا، وہ بھی گھبرا کر خفقان سے تنگ آ کر اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق کے توجہ زیادہ فرماؤ اور بدل اُس کا معالجہ کرو۔ التفات کا طالب

غالب

(۱۲۵)　بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اسکی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک کو تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور رہے۔ تاہل میری موت ہے، میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی۔ خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجا لاتا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا، یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق اُسی لوہے کی

دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں، خیر اس کا کیا رونا ہے یہ قید جاودانی ہے۔ جناب حکیم صاحب ایک روز ازراہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے، خدا ان کو زندہ رکھے۔ میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچے گا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ ...... اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں

از غالب

(۱۲۶) صبح شنبہ ۲۱ ماہ اکتوبر ۱۸۵۹ء اقبال نشان عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علیشاہ کی دعا پہنچے۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تتنجن، پسندے دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بھی خوش لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا سقا، مشعلچی۔ خاکروب سرکار سے متعین ہے، حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔ ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے اسکی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت۔

(۱۲۷) برخوردار سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے۔ تمھاری تحریر پہنچی۔ تم جداگانہ خط کیوں نہ لکھا کرو۔ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ پیڈ جس طرح چاہا اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا آشنا۔ اب تم ایک کام کرو، آج یا کل ڈیوڑھی پر جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں وہ لو، مان سنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو اور بیرنگ لکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھجوا دو اور اپنے خط میں جو حال شہر میں نیا ہو وہ مفصل لکھو۔ جناب حکیم صاحب کو سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔
اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو درا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں، کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں تو دان سے ابتدا نہ کروں گا وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے مگر بواسطہ کار پردازان سرکار دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی، لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے کچھ کلام نہیں ہوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں، پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں، ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ بھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمہ سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے، لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔ والدعا۔ جمعہ ۳ فروری ۱۸۶۰ء

(۱۲۸) .... یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری اُستانی کو لکھتا ہوں، کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ۔ اب اُن کو خیال ہوگا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے تم یہ خط میرا ہاتھ میں لے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ سناؤ۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپیے لے کر دس دن میں اُٹھا ڈالے، پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے مہینا دور ہے، دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔ یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنے والد کو سنا دینا اور ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی۔ میں نے تو وفادار اور جلال غور تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

غالب۔ سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء

بنام حکیم ظہیر الدین احمد خاں صاحب

(۱۲۹) پنجشنبہ ۲ نومبر ۱۸۶۵ء اقبال نشان حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علیشاہ کی دعا پہنچے۔ کہو میاں تمھارا مزاج کیسا ہے اور تمھارے بھائی مرزا تفضل حسین خاں کیسے ہیں، اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خبر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ تمھارا خط میرے خط کے جواب میں تھا، اس میں اور کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے

پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے آیا پچاس روپے پہنچا دئیے یا نہیں۔ کدار ناتھ ڈیوڑھی پر کر جعفر بیگ وفادار اور وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا' یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو' دیر نہ کیجیو۔ خط کے جواب کا طالب

فقیر غالب

بنام مرزا حاتم علی مہر

نظم

(۱۲۰)

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے　　غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی　　یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اسمیں دم کیا ہے

علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور حقوق غلامیٔ جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے مانا کہ روشناسی اس کے اجابے میں آئی ہے یہ بھی دلیل آشنائی ہے' کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہو لے اپنے کو بیگانہ یکدگر سمجھیں البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں' اگر سمجھیں سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے' خدا کرے وہ خط جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا تھا' آپ کی نظر سے گزر گیا ہو' احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لیکر پڑھ لیجئے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجئے گا۔ ہائے میں ہجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے' سچ اس کا یہ شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان

شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

(۱۳۱) بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا، آپ کی مہر انگیز اور محبت آمیز باتوں نے غم بے کسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے کہاں سے دستنبو کی مناسبت کے واسطے ید بیضا ڈھونڈھ نکالا ہے آفریں صد ہزار آفریں...... صاحب بندۂ اثنا عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدہ پر ہو، ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔ تم جو مجھ سے محبت کروگے یا میری غمگساری میں محنت کروگے، کیا تم کو غیر جانوں جو تمھارا احسان مانوں، تم سراپا مہر و وفا ہو، واللہ اسم با مسمّٰی ہو ۱۲

(۱۳۲) مرا بسادہ دلیہائے من تواں بخشد   خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل دوشنبہ کا دن ۲۰ ستمبر کی تھی، صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمھارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں وہ نہیں پہونچا کچھ شکوہ سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ نکالنے لگا، بکس میں سے وہ تمھارے نام کا خط نکل آیا اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا، اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو، بعد چاہیے عفو جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں ۱۲۔

(۱۳۳) بھائی صاحب! خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور ہم تم ایک جگہ رہا کریں۔

خدا کرے قصیدے کے چھاپے کی منظوری اور ہنڈوی کی رسید آئے گویا صفر کے مہینے میں عید آئے
ہنڈوی کا روپیہ جب چاہو تب منگواؤ اور کتابوں کی لوحیں اور جلدیں موافق اپنی رائے کے بنوالو،
...... برخوردار مرزا تفتہ کو دعا کہتا ہوں۔ بھائی اب میں اس کا منتظر رہتا ہوں کہ تم اور مرزا صاحب
مجھ کو لکھو کہ لو صاحب دستنبو کا چھاپہ تمام کیا گیا اور قصیدہ چھاپ کر ابتدا میں لگا دیا گیا، مادہ تاریخ
میں کیا برائی ہے جو تمھارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو مادہ اچھا ہے قطعہ لکھو
اور خاتمہ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، یہ دونوں قطعے رہیں، اگر وہاں
کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ بھی کہیں اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی
کی طرف ہے بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی کی طرف ہے، مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیے اور ان کا
نام بھی اس کتاب میں چاہیے ۱۲

(۱۲۴) مرزا صاحب ہی نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس
سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے
اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی۔ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا، نہ اپنی خیر و عافیت
لکھی نہ کتابوں کا بیوار بھجوایا، ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں
کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے، یہ تو بہت دن
ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے، پھر اب ان دو کتابوں کی
جلدیں بنجانے کی کیا خبر ہے ...... میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا، ضیاء الدین خاں اور
حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھا لیا، اُن دونوں کے گھر لٹ گئے، ہزاروں

روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے، اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں ....

(۱۲۵) بھائی جان کل جو جمعہ روز مبارک وسعید تھا گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامہ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام بیت

سات جلدوں کا پارسل پہنچا واہ کیا خوب برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآتی بہت محال ہے میری آرزو ایسی برآئی کہ برتر از وہم و خیال ہے۔ بتاؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا، میں تو صرف اسی قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہان ہے تم جہان میں رہو ائمہ اطہار علیہم السلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن چار کے بن جائے نہ یہ کہ دو کتابوں کا سا رنگ دکھلائے، اب میں حیران ہوں کہ آیا تمہارا ائمہ لئے اُن بارہ روپوں میں برکت دی یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا دو پارسلوں کا محصول، دو رجسٹریوں کا معمول، تین کتابوں کی لوحیں طلائی یہ ساری بات اُس روپے میں کس طرح بن آئی اور کیوں کر معلوم کروں، کس سے پوچھوں، خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو، خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں وہاں تکلف کام نہیں آتا، زیادہ اس سے کہ شکر گزار ہوں اور

شرما رہا ہوں کیا لکھوں مصرعہ چارہ خاموشیست چیزے را کہ از تحسین گذشت۔

(۱۳۶) خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ مرزا تفتہ کا خط جو آپنے نقل کر کر بھیج دیا ہے میں نے منشی شیونرائن کا بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے، اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو، رقعات عالمگیری یا انشاء خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو جو عبارت اُس میں سے پسند آیا کرے وہ خط میں لکھ دیا کرو خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا، اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا اُس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا مصرعہ برات عاشقاں بر شاخ آہو۔ واقعی جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھ کو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دو دکانوں میں فرنچ اور شام پین کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں میں کہاں وہ شراب پیتے جاؤں گا اور وہ مال کیونکر اٹھاؤں گا۔ بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے اور وہ قصیدہ مجھکو بھجوائیے .... دوشنبہ کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے، انگیٹھی رکھی ہوئی ہے آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آگئے تم کو لکھ بھیجے، والسلام

(۱۳۷) بھائی صاحب تمھارا خط اور قصیدہ پہنچا اصل خط تمھارا لفافہ میں لپیٹ کر مرزا تفتہ کو بھیج دیا تاکہ حال اُن کو مفصل معلوم ہو جائے .... واقعی کہ تم نے بڑی جرأت کی فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے، بات پیدا کی مگر اپنی مردی و مردانگی سے دولت کا ہاتھ آنا سعی نیکنامی اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ اب یقین ہے کہ خدمت منصفی ملے اور جلد ترقی کرو ایسا کہ سال آئندہ تک چشم بد دور صدر الصدور ہو جاؤ۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ مغل نے تمھارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار

جو تم نے اُس کے حسن کے وصف میں لکھے تھے تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے، اب ایک یہ زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آ جائے گا کہ باہم بیٹھیں اور باتیں کریں۔ قلم بے کار ہو جائے، زبان بر سرِ گفتار آئے ۱۲۔ انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے، زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشیں ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

(۱۳۸)....بندہ پرور! فقیر شکوہ سے برا نہیں مانتا مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منھ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصہ میں کئی خط بھجوائے اور وہ الٹے پھر آئے آپ شکوہ کا ہے کو کرتے ہیں، اپنا گناہ میرے ذمہ دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں، نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہئے اپنے دعویٰ میں صادق ہوں یا نہیں، پس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں، مرزا تفتہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں، میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ان دنوں میں کہاں ہیں۔ آج توکلت علی اللہ سکندر آباد خط بھیجتا ہوں۔ دیکھوں کیا دیکھتا ہوں۔

(۱۳۹) شرطِ اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمانِ من است

حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا، جانتے ہو کہ مرزا یوسف علیخاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا اس کا منشاء کیا ہے۔ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہو گا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے، سنتا ہوں کہ وہ

ی دار آدمی ہیں، اور بھائی تمہاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں
ہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اُن میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں
لاط ہوا کرتے تھے اُس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہرحال تمہارا حلیہ
ھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ
پئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو
ھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ
داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری، بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں　　شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے
بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی مگر یہ یاد رکھئے کہ
س بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ۔ بھٹیارا
جولاہا۔ کنجڑا منہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا لاحول و لا
قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں .... پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں۔ اسباب
توقع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں، دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت
دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔

رہا سلام وہ آپ پہنچا دیں گے۔

(۱۴۰) جناب مرزا صاحب آپ کا غم فزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا، یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اسکی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھاوے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلےٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا، جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی صبر کرو اور اب ہنگامہ سازی عشقِ مجازی چھوڑو۔ بیت

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی عشقِ محمدؐ بس ست و آلِ محمدؐ

اللہ بس ماسوا ہوس۔

(۱۴۱) مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے، ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں

ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ ہی مناجان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی اقامتِ جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔ بیت

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

بنام حکیم سید احمد حسن صاحب مودودی

(۱۴۲) حضرت قبلہ پہلے التماس یہ ہے کہ آپ سید صحیح النسب تمام امتِ مرحومہ محمد علیہ السلام کے قبلہ و کعبہ، جب آپ مجھ کو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں۔ خدا کے واسطے غور کیجیے کہ قبلہ قبلہ اور کعبہ کعبہ یہ کیا ترکیب ہے۔ چونکہ آپ نے مجھے استاد گردانا ہے اس التماس کو بھی از قسم اصلاح تصور کیجیے۔ زنہار قبلہ قبلہ کبھی نہ لکھیے گا۔ یہ سوءِ ادب ہے بہ نسبت قبلہ عیاذاً باللہ۔ آپ کا عطوفت نامہ پہنچا میرے پہلے خط کا بدیر پہنچنا اور اس کی دیررسی کا سبب مجھ کو معلوم ہوا۔ اب اس کا خیال رکھوں گا یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمہ باقی نہیں ہے۔ دو یا تین خط کا جواب

نہیں پہنچا اس کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوئے اور میرے پاس نہیں پہنچے ۔ بہار گلستان احمد حسن
یہ سجع کیا برا ہے ۔ دل حیدر و جان احمد حسن' یہ اس سے بھی بہتر ہے۔ انھیں دونوں میں ایک
سجع مہر پر کھدوا لیجیے۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔

غالب

(۱۴۳) حضرت پیر و مرشد ان دنوں میں اگر فقیر کے عرایض نہ پہنچے ہوں یا ارشاد کے جواب ادا نہ ہوئے
ہوں تو موجب ملال خاطر اقدس نہ ہو ۔

اتفاق مقر افتاد بہ پیری غالب   انچہ از پائے نیامد ز عصامی آید

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا' دعا گو دولت
کو در دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلی سے رام پور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل تہ دہا
پہنچا۔ بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دلی پہنچا۔ غرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن
مراد آباد میں صاحب فراش رہا۔ اب جیسا فرسودہ رواں ناتواں تھا ویسا ہوں' جواب خطوط مجتمعہ لکھ
سکتا ہوں۔ بہرحال ایسا ہوں۔ نواب میر جعفر علی خاں مبرور مغفور کا خاندان سبحان اللہ ۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است   ایں خانہ تمام آفتاب است

نواب میر غلام بابا خاں میرے دوست اور میرے محسن ہیں۔ راہ و رسم نامہ و پیام مدت سے باہم دگر جاری
ہے۔ آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب میر ابراہیم علی خاں صاحب اور حضرت میر علی خاں صاحب
کی خدمت گزاری کو اپنا فخر و شرف جانوں گا۔ اس وقت بکس کھولا ہے خطوط اطراف و جوانب دیکھ رہا ہوں
پہلے حضرت کے خط کا جواب بہ طریق اختصار لکھا ہے اب جب اس کا جواب آئے گا تب فقیر حسب حکم

بجا لائے گا۔

اسد اللہ ۔ چار شنبہ ۱۷ رجنوری ۱۸۶۶ء

(۱۴۴) پیر و مرشد آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے، جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہات سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بہ سبب کبر سن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

راقم اسد اللہ خاں **غالب** ۔ ۸ راپریل ۱۸۶۶ء

(۱۴۵) سید صاحب و قبلہ حکیم سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کا سلام پہنچے۔ وہ جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے سو محض غلط ہے، آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوائی ہیں، جو میں کہتا گیا ہوں وہ غریب لکھتا گیا ہے۔ آپ سید ہیں اور بزرگ ہیں میرے حق میں دعا کریں کہ اب تہتر برس سے آگے نہ بڑھوں، اور اگر کچھ زندگی اور ہے تو حق تعالیٰ تھوڑی سی صحت اور طاقت عنایت کرے تاکہ دوستوں کی خدمت بجا لاتا رہوں۔

۲۳ رجولائی ۱۸۶۷ء ۔ **غالب**

(۱۴۶) جناب سید صاحب و قبلہ سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کی بندگی مقبول ہو اور یہ عرض بھی قبول ہو کہ جناب معلی القاب نواب ابراہیم علی خاں بہادر کی خدمت میں میری بندگی عرض کریں۔

بارے بصورتِ تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچنا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجالانی نہیں ہوسکتی مگر خیر حضرت کے پیشِ نظر حاضر رہوں گا، عنایت کی نظر رہے۔ میرے حال پر یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کے ہاں اس مہینے میں لڑکا پیدا ہونے والا ہے مجھ کو تاریخ تولد کا خیال رہے گا۔ جب آپ کی تحریر سے نوید تولد معلوم کرلوں گا تب قطعہ یا رباعی جو کچھ ہوگی ہوگی وہ بھیج دوں گا۔ اور یہ جو آپ نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں اس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔

غالب ۔ ۱۷ر جولائی ۱۸۶۲ء

بنام خواجہ غلام غوث خاں صاحب میر منشی المتخلص بہ بیخبر

(۱۴۷) اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے۔ یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پاکر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دو عدد پارسل اور خط ایک ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہرگونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے کس واسطے کہ اس خط میں حاکمِ اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں پارسل اور دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے، مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا۔ جب تک کہ حضرت اس سررشتے سے معلوم کرکے نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانیے اور یہ دل سودا زدہ۔ ہیں اس کی سپارش کرنے والا کون۔ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں، بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کرسکتے ہیں کہ نذر ولایت کی ولایت کو

روانہ ہوئی یا نہیں۔ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں۔ پیشگاہ حکام سے موافق دستور کے خط کا امیدوار رہوں یا نہیں۔ اپنے حسن طبع کا شکر گزار رہوں یا نہیں۔ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا مجھ کو جلا لیجیے گا۔ لوہارو کا خط ایک معتمد کے ہاتھ بھیج دینا۔

(۱۴۸) قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند، اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ وہ روپیہ دیتے ہیں نہ جوابِ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سنیے ادھر کی۔ ۱۸۵۷ء سے بموجب تحریر وزیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ہوں گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں۔ مقید و مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھیجا ہے بقلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں، ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول کی اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے ....

(۱۴۹) جناب عالی۔ آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا، ابر گھر رہا ہے ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے ؎

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام من از مے تہی

غمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا۔ سرنامہ کو دیکھ کر اس راہ سے کہ دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے بہت خوش ہوا۔ خط کو پڑھ کر اس رو سے کہ مضمون مدعا کے ذکر پر حاوی نہ تھا، افسردگی حاصل

ہوئی ؎

ما خانہ رمیدگان ظلمیم — پیغام خوشں از دیار ما نیست

اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا جواب لکھنے لگا۔ پہلے تو یہ سنیئے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا مگر وہ دوبار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ میں جواب اس کا نشان مرقومہ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں، جواب الجواب کا منتظر ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مستغنی استغنا ہے، پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گزر جائے گی، جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے، مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے قطعہ

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مُرد
ور بگویند در کدامی سال — مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد

اب بارہ سو چہتر ہیں اور غالب مرد کے بارہ سو ستہتر ہیں، اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں ۱۲

(۱۵۰) پیرو مرشد یہ خط ہے یا کرامت ہے۔ صاف صفائی ضمیر و کشف حجاب کی علامت ہے مدعا ضروری التحریر اور اندیشہ نشان مسکن دامنگیر۔ اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج یہ خط کیونکر لکھا جاتا سبحان اللہ جس دن یہاں مجھ کو وہ مطلب خطیر پیش آیا ہے اسی دن آپ نے وہاں لکھنے کو قلم اٹھایا ہے، آپ کو عارف کامل کیونکر نہ لکھوں اور کیا کہوں ولی اگر نہ کہوں۔ مدعا بیان کرتا ہوں مگر

بگمان کرتا ہوں کہ یہ خط پہنچنے نہ پائے گا کہ وہ راز سربستہ آپ پر کھل جائے گا یعنی یکشنبہ ۲۸ نومبر دو خط اور دو پارسل ..... روانہ کر چکا ہوں ...... خط دونوں اگر پہنچ گئے ہوں تو کیا عجب ہے بلکہ سچ تو یوں ہے کہ اگر نہ پہنچے ہوں تو بڑا غضب ہے ....

(۱۵۱) مولانا بندگی - آج صبح کے وقت شوق دیدار میں بے اختیار نہ ریل نہ ڈاک - توسنِ ہمت پر چل دیا ہوں جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا اور کب پہنچوں گا اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم جواب نہ دو گے میں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا - آپ کا پہلا خط رام پور سے دلی آیا، میں راہ میں تھا - پھر دلی سے خط رام پور پہنچا، میں وہاں بھی نہ تھا خط دلی روانہ ہوا اب کئی دن ہوئے کہ میں نے ڈاک سے پایا اس حال میں کہ میں بیمار تھا - معہذا جاڑے کی شدت بھادوٹ کا مہینہ، دھوپ کا پتہ نہیں پردے چھٹے ہوئے، نشیمن تاریک آج نیر اعظم کی صورت نظر آئی دھوپ میں بیٹھا ہوں خط لکھ رہا ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں - اس خط کے مضامین اندوہ فزا نے دل مضمحل کر دیا - جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مغفور تمہارے ماموں ہیں - نگران کے اور تمہارے معاملات مہرو ولا جیسے کہ تمہاری تحریر سے اب معلوم ہوئے میرے دلنشیں نہ تھے - ایسے محب کا فراق اور پھر بقید دوام کیوں کر جانگزا نہ ہو - حق تعالیٰ ان کو بخشے اور تم کو صبر دے - حضرت میں بھی اب چراغ سحری ہوں، رجب ۱۲۷۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتروں سال شروع ہو گیا، طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی بقول نظامی ع یکے مردہ شخصم بمری روا

(۱۵۲) بندہ گنا ہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں ..... خواجہ صاحب کی رحلت کا اندوہ بقدر قرب قرابت

آپ کو اور بانداز مہر و محبت مجھ کو وہ مغفور میرا قدر داں اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق اس کو اعلیٰ علیین میں بہ سبیل دوام قیام دے۔ رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدتِ طرز اس کا نام ہے جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکھنی برہان قاطع کے جھگڑے میں بخلاف اور فارسی دانوں کے توفیق انصاف عطا کرے۔ لو اب اس خط کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے۔

(۱۵۳) قبلہ حاجات قطعہ میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے وہ تو ایک لطیفہ بسبیل دعا ہے۔ مگر ہاں یہ کشف یقینی ہے اور مخدوم کی روشن دلی اور دور بینی ہے کہ جو سوالات میں نے ۳۰ جنوری کو کئے اُن کے جواب تم نے ۲۷ جنوری کو لکھ کر بھیج دیئے کیوں نہ کہوں روشن ضمیر ہو اگرچہ جوان ہو مگر میرے پیر ہو۔ خلاصۂ تقریر یہ کہ ۳۰ جنوری کو آخر روز میں نے ڈاک میں خط بھجوایا اور ۳۱ کو ڈاک کا ہرکارہ پہر دن چڑھے تمہارا خط لایا سوالات میں ایک سوال کا جواب باقی رہا ہے یعنی جناب اونشٹن صاحب بہادر کی جگہ چیف سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ کون ہوا۔ یہ دل میں پیچ و تاب باقی رہا۔ .... کل کا بھیجا ہوا خط اور یہ آج کا خط یقین ہے کہ دونوں معاً ایک وقت میں پہنچیں وہ تو جواب طلب نہیں اس کا جواب لکھیے اور بہت شتاب لکھیے۔

(۱۵۴) میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے یوں سنا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا جھگڑا استعجاب پر ہے۔ استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے

شاگرد ہیں اور وہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیا کا یہ حال ہے وائے برحال ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں لیکن فقیر آزادہ ہوں نہ شیاد و کیاد۔ ستر برس کی عمر ہے بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں سے عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا دوست خیرخواہ خلق حسن و جمال چشم بددور کمال مہر و وفا صدق و صفا نورٌ علیٰ نور۔ میں آدمی ہوں آدم شناس ہوں ؎

نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل — مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیدان رفتم

غایت مہر و محبت جس کے ملکہ کا تم کو مالک سمجھا ہوں وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے دو آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتم دار سمجھا ہوا تھا۔ ایک کو تو میں رو لیا۔ اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اس کا داغ نہ مجھے دکھائیو۔ اس کے سامنے مروں میاں میں تمہارا عاشق صادق ہوں ....

بنام نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر

(۱۵۵) جناب قبلہ و کعبہ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ ایک سال ہزار جلد بن جائے میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ

اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی نثر سب کی نظر سے گزرے اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے، کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنو کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا، اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو۔ وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفصیل سے لکھ کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں، اگر دیں تو میرے کس کام کا پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اوروں کے نام کر دیئے گئے ہیں اور اس میں اُسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط ہر شعر غلط ہر مصرعہ غلط، یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم اس صورت میں میں تلافی کا کفیل جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بہرحال راضی ہو جاؤ، اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اُس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔ رحم و کرم کا طالب

غالب

بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں صاحب

(۱۵۶) بھائی تمھارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی

یک نظر دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں زیادہ زیادہ۔ آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام معاف رکھنا والسلام۔

(۱۵۸) بھائی تمھارا خط پہنچا، کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھتا۔ پھر سوچا کہ مبادا تم آزردہ ہو اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو لکھتا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمھیں لکھوں اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو۔ تمھارے اب وعم مع الخیر اپنی جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا اس کا مضمون یہی ہو گا خاطر جمع رکھنا اور اگر میرا خط دو چار دن نہ پہنچے تو مجھ کو اسی مضمون کے ظہور کا منتظر سمجھنا اور گلہ نہ کرنا اور ہاں صاحب تم جو خط لکھتے ہو تو اس میں احمد سعید خاں کا کچھ ذکر نہیں لکھتے۔ لازم ہے کہ اس کی خیر و عافیت اور اس کی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔ یہاں تمھاری پھوپی اور تمھارے دونوں بھتیجے اچھی طرح ہیں۔ والدعا۔

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۶ء — از غالب

(۱۵۹) میاں مرزا شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہو گا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہونچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اُن میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی لی کباب کھائے۔ لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے، آپس کی صلاح و مشورت سے کام

کام کرتے ہیں، اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھالیتے ہیں۔ آج میں نے تمہارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڈھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آگئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھالیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مطالبے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔

(۱۶۰) نورچشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو۔ یہ جو رقعہ لے کر پہنچتے ہیں ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں۔ دواسازی میں یگانہ۔ رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان کا چچا میر فتح علی پندرہ روپیہ مہینے کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال ان سے کہا گیا کہ پانچ روپیہ مہینا ملے گا اور لوہارو جانا ہوگا۔ انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں میں کیا کھاؤں گا، یہاں زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا۔ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے، اگر کام تمہارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں بغیر اس کے کسی طرح نہیں جا سکتا۔ سنو میاں حق بجانب اس غریب کے ہے، روٹی بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آجائے گا۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔ اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہہ مجھے پیشگی دو تاکہ کچھ کپڑا لتا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں۔ راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اپنی رائے اس باب میں لکھ نہیں سکتا۔ خیر تم بھی میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔ غالب۔ سہ شنبہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء۔

بنام میر افضل علی عرف میرن صاحب

(۱۶۱) سعادت و اقبال نشان میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب، خدا تم کو سلامت رکھے اور پھر تمہاری صورت مجھ کو دکھائے۔ تمہارا خط پہنچا۔ آنکھوں سے لگایا۔ آنکھوں میں نور آیا۔ دل پر رکھا مزا پایا۔ کل تک اس نام کو سن کر شرماتے تھے اور آپ ہی آپ کھلے جاتے تھے، اب بن بن کر باتیں بناتے ہو اور ہم کو کڑیاں سناتے ہو۔ کاش کہ تم یہاں آجاؤ تب اس تحریر کا مزا پاؤ۔ میر مہدی صاحب وہ تحریر تمہاری بہ نسبت میرے دیکھ کر بہت خفا ہوئے، چنانچہ اب جو تمہاری ان کی ملاقات ہوگی تو تم کو معلوم ہوگا۔ بھائی تمہارے سالے صاحب غرور کے پتلے ہیں، دو ایک بار میں نے ان کو بلایا انھوں نے کرم نہ فرمایا۔ تم سچ کہتے ہو یہ لوگ اور ہی آب و گل کے ہیں، تمہاری ان کی کبھی نہ بنے گی اور گہری نہ چھنے گی۔ وہیں بیٹھے رہو دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ رنج و عذاب کا زمانہ جلد گزرتا ہے۔ میر سرفراز حسین صاحب کو میری دعا کہنا اور کہنا بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سیکڑوں عزیز راہی ملکِ عدم ہوئے۔ سیکڑوں ایسے مفقود الخبر ہو گئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں، دو چار جو باقی رہے ہیں، خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی پھر دعا۔ دوشنبہ ۹ نومبر ۱۸۵۸ء بین الظہر و العصر۔ حوالہ میر مہدی طال عمرہٗ۔

(۱۶۲) برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طال عمرہٗ۔ بعد دعا کے واضح رائے سعادت انتما ہو۔ آپ کا خط پہنچا اگرچہ میں نے صرف پڑھا۔ میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔ ہاں صاحب تم نے جو لکھا ہے کہ قبلہ و کعبہ کہنے سے وہ صاحب بہت خوش ہوتے ہیں، کیوں نہ خوش

ہوں، خوشی کی بات ہے۔ تمہارے سر کی قسم میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے، وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کر لینی اور مسکرانا۔ خدا کبھی مجھ کو بھی وہ صورت دکھلائے۔ میر نصیر الدین یہاں آ گئے ہیں، تم مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو میری دعا کہنا اور میر مہدی پوچھیں تو کہنا کہ تم کو کچھ نہیں لکھا۔ کل میں نے منگوائی تھی سولڑکی کو ابھی تپ آئے جاتی ہے۔ یقین ہے کہ تم نے وہاں پہنچ کر مولوی مظہر علی کو خط لکھا ہو گا، ہاں تم کو ضرور ہے اُن سے نامہ و پیام کی رسم رکھنی والدعا۔ چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء۔

(۱۶۳) میری جان تمہارا رقعہ پہنچا۔ نہ کھلا کہ میر سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں۔ بہر حال میر مہدی کو دعا کہنا اور میر سرفراز حسین سے یہ پوچھنا کہ تم جے پور چلے ہیں نے تم کو خدا کو سونپا تم مجھ کس کو سونپ چلے۔ جواب کا طالب

غالب۔ ۲۱ر جولائی ۱۸۶۴ء

بنام مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک

(۱۶۴) ..... خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے ناامید نہ رہو۔ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرا کو اپنا نصب العین رکھو ع درطریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست۔ گھر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آ جاتا ہے۔ رضوان

ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا۔ اپنی مرگ کا طالب

غالب - صبح دوشنبہ ۷ صفر و ۱۱ جولائی سال حال۔

(۱۶۵) میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرامگاہ و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے، آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے او غلاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا۔ بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے، یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

بنام مرزا شمشاد علی بیگ خاں صاحب رضوان

(۱۶۶) فرزند دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو، اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی غازی آباد سے جاکر طبع اقدس ناساز ہو گئی مصرع از آمدن کعبہ پشیماں شدہ باشی۔ قربان علی بیگ خاں کو دعا کہنا۔ مرزا تفضل حسین خاں کو دعا کہنا اور اُن کا حال لکھنا۔ آج شنبہ ۹ر نومبر کی ہے پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں، فرما گئے ہیں کہ دو ہفتہ میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا، اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا، خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔ پیرجی بہت یاد آتے ہیں اُن کو دعا کہنا اور یہ کاغذ پہلے تم پڑھنا پھر سالک کو پڑھانا۔ پھر میاں خواجہ امان اور حکیم رضا خاں کو دکھانا۔ پھر مرزا تفضل حسین خاں کے پاس لے جانا۔ اس قصیدہ کے ساتھ کی نثر نواب ضیاء الدین خاں یا مرزا ثاقب سے مانگ لینا اور اس کی نقل کر لینا...... آج دوشنبہ ۹ر نومبر کی ہے آٹھ دن میں خط کی آمد و شد یقینی ہے نو دن راہ دیکھوں گا۔ دسویں دن اگر تمہارا خط نہ آیا تو میں تمہارا رافضی بن جاؤں گا۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا طالب

غالب

(۱۶۷) مرزا رسم تحریر خطوط بہ سبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں۔ اب مجھے ویسا نہ سمجھو جیسا چھوڑ گئے ہو۔ رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حُسنِ فکر، لطف

طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔ تمھارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محلِ ترحم ہے نہ مقامِ شکایت۔ سنو میرے خط کے نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو۔ جب تک زندہ ہوں غمزدہ وافسردہ ناتوان نیم جاں ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سُن لوگے، پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو جانو کہ غالب جیتا ہے۔ خستہ و نشرمندر نجور رودرد مند یہ سطریں لکھ کر اس وقت تمھارے بھائی پاس بھیجتا ہوں مگر اُن کو ہمیشہ سفر در وطن ہے۔ بفرضِ محال اگر گھر میں ہیں تو عنایت اللہ اُن کو ورنہ محمد مرزا کو دے آئے گا۔ ربیع الثانی جمعہ کا دن صبح کا وقت ہے۔

بنام مرزا باقر علی خاں صاحب کامل

(۱۶۸) اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط آیا۔ تمھارے روزگار کی درستی آگے سُن چکا تھا۔ اب تمھارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے تمھاری ترقی انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہوگی۔ مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا بھائی اب میری انگلیاں نکمّی ہوگئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے، دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں جب کوئی دوست آجاتا ہے میں اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمھارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے، میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔ تمھاری دادی اچھی طرح ہے۔ تمھارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمھارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمھاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

(۱۶۹) نورِ چشم و راحتِ جان مرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط جو میرے خط کے جواب میں تھا وہ مجھ کو پہنچا اُس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی تمہیں اطلاع دیتا ہوں وہ امر یہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں سبدِ چین کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشان مرزا تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی سو اب کے ہفتہ میں حضور پر نور مہاراؤ راجہ بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے از راہ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا اچھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کئے۔ تم تو وہیں ہو تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں۔ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں۔

۷ر دسمبر ۱۸۶۷ء - **غالب**

(۱۷۰) اقبال نشان باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ تمہارا خط آیا مگر تم نے اپنے مکان کا پتا تو لکھا ہی نہ تھا فقط الور کا نام لکھ کر چھوڑ دیا۔ میں کیوں کر خط بھیجتا یا رے اب شہاب الدین خاں کی زبانی پتا معلوم ہوا سو اب میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ جینا بیگم اچھی طرح ہے میرے پاس آتی رہتی ہے اور تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ اکتوبر کے مہینے کی تمہاری تنخواہ تمہارے گھر بھیج دی۔ مرزا حسین علی خاں بندگی عرض کرتا ہے۔

اسد اللہ۔ تحریر تاریخ ۱۶ر نومبر ۱۸۶۷ء

بنام ذو الفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا صاحب

(۱۷۱) بھائی تمھارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں...... میں کیا کروں اگر کہوں کہ میری جان بھی تمھارے کام آئے تو میں حاضر ہوں۔ یہ کہنا تکلّف محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے مگر چونکہ مجھ کو تمھاری ہے اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اوائل ماہ آئندہ یعنی نومبر میں نیرو الا مقدمہ درست ہو جائے۔ ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی چنی لال تمھارا قرض خواہ آیا تھا۔ تمھارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ جھوٹ کہہ کر اس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپیہ تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح کی تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالا جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمھارے کھیت ہیں۔ پانی دو تو اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے تمھارے مکان کا پتہ لکھوا کر لے گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے راجی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ ہی بھیج دے تو تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔ بس زیادہ کیا لکھوں۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سردار مرزا صاحب تشریف لائے۔ میں نے خط ان کو نہیں دکھایا مگر عند الاستفسار کہا گیا کہ خط حسین مرزا صاحب کو لکھتا ہوں انھوں نے کہا میرا سلام لکھنا اور لکھنا کہ یہاں سب خیر و عافیت سے ہیں اور سب کو دعا سلام کہتے ہیں۔ یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اس وقت سردار مرزا سے دریافت ہو گیا کہ عباس مرزا کے نام کا

تمہارا رقعہ اُن کو پہنچ گیا۔ شنبہ ۲۹ اکتوبر۔

(۱۷۴) جنابِ عالی کل آپ کا خط لکھا ہوا سہ شنبہ یکم نومبر کا پہنچا۔ لطف یہ کہ کل وہی سہ شنبہ کا دن ۸ نومبر کی تھی۔ آج بدھ کا دن ۹ نومبر کی صبح کے وقت میں تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا کہ برخوردار یوسف مرزا خاں کا خط لکھا ہوا ۳ نومبر کا پہنچا۔ اب میں دونوں خطوں کا جواب باہم لکھتا ہوں۔ دونوں صاحب باہم پڑھ لیں...... آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آ رہیں مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ تم انصاف کرو، ہمشیرہ کی درخواست کیونکر گزرے جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستان ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور اُن کو یہاں رہنا ہو گا کیونکہ اُس ویرانہ میں تنہا رہیں گی۔ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں۔ کھائیں گی کہاں سے۔ بہرحال یہ سب خیالات خام اور حیلے ناتمام ہیں۔ ہاں نقل لینی اور مرافعہ نہ کرنا اور نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا پھر اُس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا۔ مختار عدیم الفرصت، بیں پاشکستہ۔ محمد قلی خاں کبھی یہاں، کبھی وہاں، وقت پر موقوف ہے۔ گہر اُونہیں حکیم احسن اللہ خاں کے مکاناتِ شہر اُن کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، دروازہ سے باہر نہ نکلو۔ اپنے گھر میں بیٹھے رہو...... مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے انھوں نے زمین پکڑی ہے سلطان جی میں رہتے ہیں، عذر کر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ جبر اُٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں۔

(۱۷۳) نواب صاحب، پرسوں صبح کو تمہارا خط پہنچا .... اب غالب کی مصیبت کی داستان سنئے۔ پرسوں تمہارا خط پڑھ کر لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا اُن کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا تھا، جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانہ میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید ہے نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنشن انا للہ وانا الیہ راجعون .... جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں یا وہ احکام قضا و قدر ہیں، اُن کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے نہ املاک رکھتے تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔ رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ للہ تم وہاں جاؤ تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہلال ماہِ رجب المرجب رام پور میں دیکھوں جو نذیر و شیقہ کے باب میں تم نے کی ہے وہ بہت مناسب ہے بشرط پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے سجاد مرزا اور اکبر مرزا اپنی پیرانہ سری میں اُس پر قابض ہو رہیں گے۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔ یوسف مرزا خاں کو دعا پہنچے۔ حال قصیدہ و مخمس کا معلوم ہوا قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں جو آبا و اجداد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ اُن کو منظور ہے کہ دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں سو کارساز ما بہ فکر کار ما۔ لیکن میری جان انصاف تو کرو ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی یہ فکر بھی بیہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک۔ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس نہ جاڑے کی شدت نہ گرمی کی حدت نہ حکم کا خوف نہ مخبر کا خطرہ،

نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے نہ کپڑا خریدنا پڑے نہ گوشت گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عا
اور سراسر سرور سے

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است　　　　تو بدیں آرزو مرا برساں

بندہ علی ابن ابی طالب آرزو مند مرگ

غالب ۔ روز سہ شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

بنام یوسف مرزا صاحب

(۱۷۴) کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو لو صاحب وہ آئے۔ میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اب سن لو تفضل حسین خاں اپنے ماموں موید الدین خاں پاس میرٹھ ہے۔ شاید دلی آیا ہو مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد ان کے غلام علی خاں اکبر آباد میں ہیں کتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتے گئے تھے۔ تمھارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس آگئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ ادھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں ادھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو مگر میری جان ہم کو کیا ع عالم پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب ۔

(۱۷۵) آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یکشنبہ کا دن ہے۔ ساتویں تاریخ رمضان کی اور انیسویں اپریل کی صبح کو بھائی فضلو حسین کہ میر کاظم علی بھی کہتے ہیں۔ وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا اور دو سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور کو روانہ ہوئے

پھر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ خط میرے نام کا اور ایک حکم نامہ محکمۂ لاہور موسومہ میر کاظم علی لایا۔ یہاں
لکھ چکا تھا کہ تمہارے ماموں صاحب مع سجاد مرزا تشریف لائے۔ تمہارا خط اُن کو دے دیا وہ
اُس کو پڑھ رہے ہیں اور میں یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں۔ پہلے تو یہ لکھتا ہوں کہ حکم نامہ میر کاظم علی کو دے
دینا اور میری طرف سے تعزیت کرنا کہ خیر بھائی صبر کرو اور چپ ہو رہو۔ .... ناظر جی صاحب
اور سجاد مرزا اپنے گھر گئے وہ تم کو دعا اور سجاد بندگی کہہ گیا ہے۔ اپنے آنے میں جلدی نہ کرو حکام کی
رضا جوئی کو سب امور پر مقدم جانو۔ میں ابھی رامپور نہیں جاتا۔ برسات بعد بشرطِ حیات جاؤں گا
یعنی اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں قصد ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط دو دن میر کاظم علی کے پہنچنے سے
پہلے تمہارے پاس پہنچے۔ اُن کے نام کا حکم نامہ بہت احتیاط سے اپنے پاس رہنے دینا۔ خبردار
جاتا نہ رہے۔ جب وہ پہنچیں تب اُن کو حوالہ کرنا۔ صاحب تم خمس نہ نذر یہ باتیں غیرت کی ہیں۔
جس طرح اپنے اور بچوں کو دوں گا مظفر مرزا اور تم کو بھی اسی طرح بھجوا دوں گا۔ ہمشیرہ عزیزہ کو
یعنی اپنی والدہ کو میری دعا کہنا۔ مرقومہ یکشنبہ وقت نیم روز ہفتم رمضان ۲۹ اپریل

غالب

(۱۷۶) یوسف مرزا! کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ
اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور
یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا
کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے
بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو

تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے اگر سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ پنشن کا روپیہ مل گیا تھا وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے جو مجرم ہو کر ۱۴ برس کو مقید ہوا ہو اُس کا پنشن کیونکر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا۔ رسید کس سے لی جائے گی۔ مصطفےٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا مگر پنشن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں لیکن بہت عجیب بات یہ ہے تمھارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب عیاذاً باللہ۔ علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے، سوچے ہوں گے کہ ان دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر تمھاری دادی کا خط جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا وہ میں نے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ اُن کی جاداد کی واگذاشت کا حکم ہو تو گیا ہے اگر اُن کے بڑے بھائی کے یار اُن کو چھوڑیں، دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط جواب طلب نہ تھا، تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپی کا اور تمھارا سرانجام دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوگا کیا، اگر جاداد یں مل بھی گئیں تو قرض وار دام دام لے لیں گے۔ رزاقِ حقیقی پنشن دلوائے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ شنبہ، ۲۱ شوال و ۲۰ مئی سال حال۔ **غالب**

(۱۷۷) اے میری جان، اے میری آنکھیں ؎

زہجران طفلے کہ در خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا، وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا، یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو، خدا تم کو جیتا رکھے اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو، وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا ہی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلیٰ ہے یہ داغِ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔ والد کی خدمت بجا نہ لانے کا ہرگز افسوس نہ چاہیئے کچھ ہو سکتا ہو اور نہ کیا ہو تو مستحقِ ملامت ہوتے۔ کچھ ہو ہی نہ سکے تو کیا کرو۔ اب تو فکر یہ بڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں اور کھائیے کیا۔ مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اُن کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہو لیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ناظر جی کو سلام کہنا اور کہنا کہ حال اپنا مفصل تم کو لکھ چکا ہوں وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے ورنہ خیر کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے شعر کہا نہیں اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ ہے بھی تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اُس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالہ بھی جانب دار نہیں۔

.... ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں، قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے صرف حکم کی دیر۔ پرسوں

وہ حاضر ہیں مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، سارا جہان بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے۔ ہاں صاحب خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا میں ملنے جاتا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا۔ کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا۔ میرن صاحب آج کل پانی پت کو جایا چاہتے ہیں۔ میر کاظم علی ابن میر قلندر علی الور سے آئے ہوئے سلطان جی میں اترے ہوئے ہیں۔ دن پندرہ ایک ہوئے محمد قلی خاں میری ملاقات کو آئے تھے علی جی میں رہتے ہیں.........

(۱۷۸) میری جان خدا تیرا نگہبان میں نے گڑ پھینک کر دام میں پھنسایا۔ پھر قفس میں بند کر کے یہ رقعہ لکھوایا۔ میر ارتضیٰ حسین کو فقط اُن کے نام کی جو عبارت ہے وہ پڑھا دینا تاکہ اُن کی خاطر جمع ہو جائے۔ "اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو یہ سلام باعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سعادت کے اور ہا باعتبار یگانگی اور اُستادی کے کہنا اور کہنا کہ بھائی کیا لکھوں۔ جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو اصل کہاں ہے کہ جس کی نقل لوں؟ ہاں زباں زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں ماہدہ اس کے خلاف ہے۔ لے لو کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں تھوں میں ہتکڑیاں حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختار کاری پہ عت کی گئی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی ن ہے نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے.......... جانتے ہو کہ علی کا

بندہ ہوں اُس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنشن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھئے آتا ہے یا نہیں اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں......

(۱۷۹) میاں پرسوں قریب شام مرزا آغا جانی صاحب آئے، وہ اور اُن کے متعلق سب اچھی طرح ہیں۔ جو بیگ ہانسی گئے۔ کل تمھارا خط آیا۔ بھائی تمھیں خارش کیوں ہوئی۔ حسین مرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے، خدایا ان آوارگان دشت غربت کو جمعیت جب تو چاہے عنایت کر۔ مگر تصدق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ حسین مرزا کی ڈاڑھی سفید ہوگئی، یہ شدت غم و رنج کی خوبیاں ہیں۔ اس خط کے پہنچتے ہی اپنی اور ان کی خیر و عافیت لکھنا۔ جہاں تم نے اپنے نام کا خط پڑھا وہاں کا حال یہ ہے ؂

بگفت احوالِ ما برقِ جہان ست دمے پیدا و دیگر دم نہان ست
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ہمارے خداوند ہیں قبلہ و کعبہ ہیں خدا اُن کو سلامت رکھے۔ آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے ایک بنائے قدیم رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک، محل ان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگھ بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا...... کیوں میں دلی کے ویرانے سے خوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی

نہ رہے۔ شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں .... باقر علی اور حسین علی اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی اُن کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں اور ایک دعا اور دو آداب ملتوی۔ دوا اور کلو اور کلیان کی بندگیاں پہونچیں قمر الدین خاں پرسوں آیا تھا اب آئے گا تو دعا تمھاری اُس کو کہہ دوں گا۔

غالب

(۱۸۰) یوسف مرزا میرا حال سوائے میرے خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ۔ غم فراق۔ غم رزق غم عزت۔ غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اُس کا بیٹا احمد مرزا اُنیس برس کا بچہ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ کیا میں اُن کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق، حسین مرزا۔ یوسف مرزا۔ میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر اُن کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اُس کی بیٹی اُس کے چار بچے اُس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں

پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہئے۔ اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے تین چار آدمی گھر کے کلو کلیان آیاز یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں۔ بڑھاپا ضعف قویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں گویا صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے دربار میں جاتا تھا خلعت فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں نہ بے گناہ ہوں نہ گناہ گار ہوں نہ مخبر نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔

....

بنام منشی شیو نراین صاحب

(۱۸۱) صاحب خط پہنچا۔ اخبار کا لفافہ پہنچا۔ لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بے کار آدمی کیا کرے۔ بہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے۔ ع ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپیہ مہینہ کا کیوں مول لیں گے۔ ....

(۱۸۲) نور بصر لخت جگر منشی شیو نراین کو دعا پہنچے۔ خط اور رپورٹ کا لفافہ پہنچا اور سب حال تمہارے خاندان کا دریافت ہوا۔ سب میرے جگر کے ٹکڑے ہیں اور تم اپنے دودمان کے چشم و چراغ ہو .... سنو میری جان، نوابی کا مجھ کو خطاب ہے۔ نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

(۱۸۳) برخوردار اقبال نشان منشی شیو نراین کو بعد دعا کے معلوم ہو .... میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمھاری نشانی جان کر اپنی جان کی برابر رکھوں گا۔ باقی حال اپنے خاندان اور تمھارے خاندان اور باہم مل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو

لکھ چکا ہوں مکرر کیوں لکھوں۔ بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر نہ آدمی نہ آدم زاد مگر ہاں دو ایک مصوروں کی آبادی کا حکم ہوگیا ہے وہ رہتے ہیں سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی اُن کے گھروں میں سے لٹ گئیں جو کچھ رہیں وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کرلیں ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے وہ تیس روپیہ سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے میں نے چاہا کہ اُس کی نقل کاغذ پر اُتار دے اُس کے بھی بیس روپیہ مانگتا ہے اور خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرف بے جا کیا ضرور ہے میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرلینے کا نہ خود مجھ میں مقدور نہ تمہارا نقصان منظور۔۔۔۔

(۱۸۵) صاحب تم خط کے جواب نہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہوگے۔ حال یہ ہے کہ قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہوگیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہرحال اب اچھا ہوں۔۔۔۔ منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا پہلا ناقص ہے دوسرا سراسر غلط ہے۔ کیا کہوں تم سے۔ ضیاءالدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سبھی بھائی اور میرے شاگردِ رشید ہیں جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جزو۔ اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سوا سو جز مطلّا اور مذہّب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپیہ کے صرف میں بنوائی میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی۔

اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہوگیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات قلمی ہندی کا کلیات قلمی پنج آہنگ قلمی مہر نیم روز۔ اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔ جناب ہمری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ اُن کی فرمایش یہ ہے اردو کی نثر وہ انجام پائے تو اُس کے ساتھ اُن کو خط لکھوں مگر بھائی تم غور کرو اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا۔ اور اُس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا۔ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں کون سی بات کون سی کہانی کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں۔ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ..........

(۱۸۶) بھائی حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو ع اسد اور لینے کے دینے پڑے۔ اُس غزل کے میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پہ ہزار لعنت اس سے آگے ایک شخص نے مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے یہی اُن سے کہا کہ اگر یہ مقطع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں یہ مطلع اور یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف۔ یہ قصہ تمام ہوا وہ غزل جو تمہارے

پاس پہنچ گئی ہے چھاپنے سے پہلے ایک نقل اُس کی میرزا حاتم علی مہر کو دینا جس دن یہ میرا خط پہنچے اُسی دن وہ غزل نقل کر کے اُن کو بھیج دینا۔ .... میاں تمھاری جان کی قسم نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہے نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچپن شعر بطریق قصیدہ تمھاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے سوائے اُس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہگار بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے پرسوں ایک خط تمھیں اور لکھ چکا ہوں اب اُس کا جواب نہ لکھنا۔ والدعا۔ چہارشنبہ ۲۶ اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۵۷) برخوردار منشی شیو نراین کو دعا پہنچے .... اب کے تمھارے معیار الشعرا میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں، ہم کو جب تک اُن کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم اُن کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں، لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں، میں اُن کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں، میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اُس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا، نام اور حال وہ جو میں اوپر لکھ آیا ہوں اس کو آپ کے معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور اُن کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو کہ در رام پور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔ اور اس امر کی بھی اطلاع دو کہ رام پور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں ۱۲ مرسلہ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء۔

(۱۸۸) میاں دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو تب کچھ کلام کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط تمھارا پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا عرض داشت عظیم الدین احمد متمقام میرٹھ۔ واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا اور معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے اُنھوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجئے گا عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا۔ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔ آمدم برسر مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آ گیا تو فوراً

تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں میرا کچھ قصور نہیں ہے۔ اگر سرگذشت کو بھی سن کر مجھ کو گنہگار ٹھہراؤ تو اچھا میرا بھائی میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو۔ اور دیوان میرا میرے پاس آجاوے اور تم کو پہنچ جائے ....

(۱۸۹) میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔ منشا آن سے بھی کہوں گا اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھ لوں گا۔ تصویر میری لے کر کیا کرو گے؟ بیچارہ عزیز کیوں کر کھنچوائے گا اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ کو لکھو میں مصور سے کھنچوا کر تم کو بھیج دوں نہ نذر درکار نہ نثار۔ میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر چاہتا ہوں اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزند سعادت مند ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور مطالب عالیہ کو پہنچاوے۔ سہ شنبہ ۳ جولائی ۱۸۶۱ء

غالب

(۱۹۰) میاں میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمہارا بھیجا ہوا فرمہ مجھ کو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے

پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھپا پنے کی اجازت دوں۔ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا
میں سمجھا کہ تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیونرائن سے میری تقصیر
معاف کروا دینا۔ بھائی خدا کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اس دیوان اور تصویر کا
ذکر کیا ضرور ہے۔ رام پور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلی میں تصویر بہ ہزار
جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں وہ تمہارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو
چاہو کسی کو دے ڈالو۔ چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔ تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کے ہم کو
سوغات بھیجی تھی۔ ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا۔ میرے پیارے دوست ناظر بنسی دھر
کی تم یادگار ہو ع اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔ خوشنودی کا طالب

۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء — غالب

بنام نواب امین الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو

(۱۹۱) بھائی صاحب ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ ... میرا
تمہارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے میں تم کو چاہتا ہوں بے اس کے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو
بیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمھیں چاہتا رہا۔ تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام
یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے
قرابت اور یہ مودت کیا پیوند خون سے کم ہے۔ تمہارا یہ حال سنوں اور بیتاب نہ ہو جاؤں اور
سانہ آؤں مگر کیا کروں مبالغہ نہ سمجھو میں ایک قالب بے روح ہوں ع کیے مردہ شخصم بھر دی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی میں مر گیا۔ واللہ نہیں آ سکتا۔ باللہ نہیں آ سکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن۔ میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری ہی اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بےکسوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مر جاؤں تاکہ اس قافلہ کو اگر روٹی نہ دوگے تو چنے تو دوگے۔ اور اگر چنے بھی نہ دوگے اور بات نہ پوچھوگے تو میری بلا سے، میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔ جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آ نا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں، کثرت اطبا صحبت احبا۔ تنہائی سے نہ ملول رہوگے حرف و حکایت میں مشغول رہوگے۔ آؤ آؤ شتاب آؤ۔ بھائی میرزا علاء الدین خاں تم کو کیا لکھوں جو وہاں تمہارے دل پر گذرتی ہو یہاں میری نظر میں ہے۔ تحریر دعا، مزید عمر و دولت۔ نجات کا طالب

غالب

(۱۹۲) اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد ادائے سلام مسنون ملتمس ہوں۔ تمہارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا۔ گو نہ ملتے تھے پر اک شہر میں تو رہتے تھے۔ بھائی ایک سیر دیکھ رہا ہوں

می طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں اُن میں سے دو چار بھولے بھٹکے یہاں
جاتے ہیں۔ لو صاحب اب وعدہ کب وفا کرو گے علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے
ن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی
چلنے والا کہے گا میں رہرو چالاک ہوں تیراک نہیں۔ لوہارو سے دلی تک کشتی بغیر کیوں کر جاؤ
ں جہاز کہاں سے لاؤں ع اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش۔ علائی کے دیدار کا
ب غالب۔ اُستاد میر جان صاحب کو سلام۔ یوم الخمیس ۱۷ محرم سنہ ۱۲۸۰ھ

۱۹) برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت۔ بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت
افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کی رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری
گو ہر تواں گفت‘ اختر نتواں گفت جو تمہارے حسب الطلب بھیجی گئی ہے کیا نہیں پہنچی؟ پہنچی
ی ہو گی‘ تم بھول گئے ہو گے۔ وکیل حاضر باش دربار اسد اللٰہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل
وشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی اگر پسند آئے تو مطرب کو
ھائی جائے۔ ...... اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔ والسلام مع الاکرام
ات کا طالب

غالب

۱۹۴) برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت۔ تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک
زل نئی لکھ کر بھیجی ہے خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں یا سوانح
یل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اول روز بڑے زور کی آندھی آئی پھر خوب مینہ برسا وہ جاڑا

پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھا یا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹا یا گیا۔ کشمیری کٹڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیرِ زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے، مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام کنگری کہتے ہیں، اُن میں سے ہلا ہلا کر ایک کی بنا ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال، عسیر الحال، عربی، فارسی، انگریزی، تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلہ میں ٹھہرا ہے۔ بہ سبب ضرورت حکام شہر سے مل گیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ درویش کے تکیہ پر آ جاتا ہے۔ اہلِ شہر حیران ہیں کہ کھانا کہاں سے ہے، اس کے پاس روپیہ آتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتے ہیں یہ باپ سے بچھڑ گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو۔ غالب علیشاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔ جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء۔

(۱۹۵) بھائی صاحب آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعائے مغفرت، سو بھائی اظہارِ غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کی جائے؟ رہی دعائے مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا

نکلتی ہے۔ مہنذا تمہارا یہاں آنا سنا جاتا تھا اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہوا، یہ چند سطریں لکھی گئیں حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست و خوش رکھے۔ تمہاری خوشی کا طالب

غالب ۔ ۱۵ر نومبر ۱۸۶۶ء

(۱۹۶) جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت۔ بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت و ازدیاد عرض کیا جاتا ہے کہ استاد میر جان آئے اور اُن کی زبانی تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ خدا تم کو زندہ تندرست و شاد و شادماں رکھے۔ یہاں کا حال کیا لکھوں بقول سعدی علیہ الرحمۃ ع

نماند آب جز چشم یتیم۔ شب و روز آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے نہ رات کو تارے۔ زمین سے اٹھتے ہیں شعلے آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں عقل نے کہا کہ دیکھ نادان قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی بھائی ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے وہ اور بھی جانگزا ہے۔ خیر اب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا آیا اُس کا باپ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیوں صاحب یہ تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی کہا جناب عالی آغا جان کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔ کہا حضرت میں تو آغا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں

کیوں مل گئے۔ سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم! میں اس کی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے۔ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین و حیدر حسن اور اُن کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ علاء الدین خاں جیسا ہوشمند ہمہ داں بیٹا۔ فرخ سیر جیسا دانشور بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا، یہ دو عطیہ عظمیٰ و موہبت کبریٰ ہیں تمھارے واسطے منجانب اللہ......

آج ۲۲ جون کی ہے۔ آفتاب سرطان میں آگیا۔ نقطہ انقلاب ...میں دن گھٹنے لگا چاہیے کہ تمھارا غیظ و غضب ہر روز کم ہو جائے۔ نجات کا طالب

غالب

بنام مرزا علاء الدین احمد خاں صاحب بہادر

(۱۹۷) مرزا رو برو بہ از پہلو۔ آؤ میرے سامنے بیٹھو۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع ۴ اسپ ۲ بڑے اور ۲ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے وقت رخصت ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتہ سے یہاں وارد ہیں اور اپنی بہن کے یہاں ساکن ہیں، کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتہ میں چلوں گا۔ آپ چال چوکے اردو لکھتے لکھتے جو خط مشتمل ایک مطلب پر تھا اُس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی منصد یا نہ نہیں کہ

میر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بصیغہ مفرد نہ لکھیں یہ وہی چھوٹی بڑی ہے کا قصہ ہے بغیر خط نہ دکھاؤں گا
مالکتب فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ میں نے تو چلتے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا
بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اس کی درستی کرتا لاؤں جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں صرف
مکان کا مقدمہ ہے سو اس مقدمہ میں میرے اور میرے شرکا کا وکیل وہاں موجود ہے اگر وہ اس
اس امر کا ذکر کرتے تو میں اُن سے اُن کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا تا لاتا۔ بہرحال
اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

(۱۹۸) .... بھائی اس مرض میں میں بھی تیرا ہم طالع اور ہمدرد ہوں اگرچہ یک فنہ
ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست پائی نہیں آپ ہی کہا آپ ہی
سمجھا قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں
بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اُس میں
شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز
جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں
اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے ......
...... خدا کا مقہور خلق کا مردود۔ بوڑھا ناتوان بیمار فقیر نکبت میں گرفتار تمہارے حال میں غور کی
اور چاہا کہ اُس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمہارا حال
اُس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ میں تھا تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے
بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک

مانگنے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

(۱۹۹) جانِ غالب یاد آتا ہے کہ تمھارے عم نامدار سے سنتا ہے کہ لغات وساتیر کی فرہنگ وہاں ہے اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے؟ مصرع اگرچہ مادر کار واریم اکثرے درکار نیست۔ تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دید وادید۔ اس کی دو صورتیں تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں۔ اور ماجرا کیا ہے۔ سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پانوں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقررہ اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا رام پور پہنچا۔

کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔...........

(۲۰۰) سعادت و اقبال نشان میرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی بہ سواری ریل مانند دولت دل خواہ کہ ناگاہ آوے فقیر کے تکیہ میں تشریف لا کے شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا۔ اب وہاں آئے ہیں۔ قریب طلوع آفتاب بچشم نیم باز یہ رقعہ تمہارے نام لکھا ہے جو کچھ جی چاہتا ہے وہ مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے۔ پس نور چشمان راحت جان مرزا باقر علی خاں بہادر و مرزا حسین علی خاں بہادر جناب آغا صاحب کا قدمبوس بجا لائیں اور ان کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں۔ پس ہاں مرزا علائی اگر کرنیل الگزنڈر اسکنر بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا.....

(۲۰۱) صاحب میری داستان سنیئے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپیہ دینے باقی رہے اور ستاسی روپیہ گیارہ آنے مجھے بچے۔ .... میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم دگر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک

مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں نہ ملا۔ تمہاری چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی۔ کڑوڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پاؤں زمین پر ہے ایک پاؤں رکاب میں۔ نوشتۂ کا وہ حال گوشہ کی یہ صورت۔ کل شنبہ ۷ ار ذی الحجہ کی اور ۷ رجون کی پہر دن چڑھے تمہارا خط پہنچا دو گھڑی کے بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے از راہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے اُن کو دُبلا و افسردہ پایا۔ دل کڑھا علی حسین خاں بھی آیا اُس سے بھی ملا۔ میں نے تحقیق پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے تھے ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔ راقم

غالب۔ نگاشتہ درواں داشتہ یکشنبہ بین الظہر والعصر

(۲۰۲) میاں تم میرے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہو جو احیا سے مرسوم و معمول ہیں۔ خیر تمہارا حکم بجالایا غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے دربار کیا میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی اس ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی کو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ہر دم دم نزع ہے دل غم سے خوں ریز ہو گیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پذیر تمہاری نظر نہیں آئی نہ مجھے تم نے یاد کیا نہ اپنے

بھائی کو کچھ لکھا۔ اب اس خط کا جواب جلد لکھو پہلے اپنے بچوں کا حال پھر وہاں کے اوضاع جیسا تمھارا قاعدہ ہے منقح اور مفصل لکھو۔ فقط نجات کا طالب

غالب

(۲۰۳) لو صاحب وہ مرزا رجب بیگ مرے اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے کل ان کی چھٹی ہو گئی آپ شریک نہ ہوئے ع اے وائے زمحرومی دیدار دگر ہیچ۔ میاں خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزا کھو دیا میں کہتا ہوں کہ اُس کی عوض میں مرجاؤں اللہ اُس کو جیتا رکھے اُس کا داغ مجھ کو نہ دکھاوے۔ یارب اُس کو اس کی اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔ نجات کا طالب

غالب

(۲۰۴) مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں اگر نیر خلیفہ اول ہے تو تم خلیفہ ثانی ہو اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ جانشین دونوں مگر ایک اول ہے اور ایک ثانی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں تم سخنور ہو گئے حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر و امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دئیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے

پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ صاحب دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نامِ تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔ سنو صاحب حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور محقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو اور اُس مسخرے کو گمنام اور ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی۔ اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانا نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دھلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔ پنجشنبہ ۴ر ماہ اپریل۔

(۲۰۵) صاحب میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روئے عقل اعادہ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم اُس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے میری طرف سے جواب وہی ہوگا جو آگے لکھ چکا ہوں یعنی میں تماشائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو

لی کہوں گا۔ آپ کے علم عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزارہا تسویلات وخیالات
لطائی دیتے ہیں یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ جس طرح
ں مبتلائے وساوس واوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس
ع الفارق ہے نہ تخیل صادق' یہاں لاموجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور
فر واسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ؎

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر

سوائے اللہ واللہ ما فی الوجود

(۲۰۶) مولانا علائی نہ مجھے خوف مرگ نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ جبریہ ہے
تم نے میاں جی گری کی۔ بھائی نے برادر پروری کی تم جیتے رہو وہ سلامت رہیں۔ ہم اسی حویلی میں تاقیامت
رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینھ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا
اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غریب روپیہ اُس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یاد
تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اُسی دروازہ سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ
کو محلسرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی ڈولی لونڈی اصیل کا چھن تنبلن تنبولن کہاری پنہاری' ان فرقوں کا
ممر وہ دروازہ رہے گا۔ میری اور میرے بچوں کی آمد ورفت دیوان خانہ میں سے رہے گی' عیاذاً باللہ
وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں اپنے بیگانے کو ہر وقت چھلپا ئیاں نظر آئیں۔ بی وفادار
جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے' باہر
نکلتی ہیں' سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں' رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں جب

محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ دروازہ کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کمائی کے ہیں (شرح تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے ہے ایسے عالی شان دیوان خانہ کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت معہذا اُس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور مکتب کے لئے ہرگز کافی نہ جانا۔ تمور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِم پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمہاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطراب نہ رہے۔ مینھ کھل گیا ہے مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے نہ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات ہوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف روشنی کا وہ عالم۔ ۱۹ ماہ اگست ۱۸۶۲ء۔

(۲۰۷) صبح سہ شنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۲ء۔ جانِ غالب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے، خدا کا احسان مرزا قربان علی بیگ تمہاری کشش کے مجذوب بنتے وہ تو خود سالک ہیں مگر ہاں یہ صاحبزادہ سعادتمند رضوان سو اس کے آپ مالک ہیں تو اب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوا۔ کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا۔ اثنا عشری ایک تم ہو سو تمہیں کیا اختیار ہے۔ البتہ عشرہ مبشرہ کی اولویت پر مدار ہے۔ باپ تمہارا خلاف قاعدۂ اہل سنت جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا، رضوان نے نہ مانا کیونکہ مانتا وہ تو ثلثہ کا دم بھرتا تھا۔ تہور خاں صاحب کے باب میں بندہ جویا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے اُن کا ارادہ کدھر کا ہے۔ رضوان کو دعا

ہے۔ نواب صاحب کی عنایت اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو۔ پیرجی سے جب پوچھتا ہوں
خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں کہ کیا کہنا ہے اور میں پوچھتا ہوں کس کا تو وہ فرماتے ہیں مرزا شمشاد
بیگ کا۔ میں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے۔ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے
ہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔ میرا شیوہ حفیظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف
ی کیا عیب ہے۔ ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں اس میں کیا ریب ہے۔

(۲۰۸) صبح یکشنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء۔ میری جان سن پنجشنبہ پنجشنبہ ۸ جمعہ ۹ ہفتہ ۱۰ اتوار ۱۱ ایک
رہ بر ہر دن مینہ نہیں تھما اس وقت شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ
لئے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا کیا کروں تمھارے خط کا جواب ضرور کو
سنتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر
کیا موقوف ہے مجھے آج سواری مل جائے کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں
گاڑی کی تدبیر ہو جائے بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی
میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ ہے ؎

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار
کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے

جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں
مطربوں نے خلط کر دیا ہو .... بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر
متھرا داس سے قرض کیا ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی، ہر ایک پاس
تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول نہ سود، اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپی
کے سر، بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا۔
اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیہ رامپور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔
وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹکس جدا۔ چوکیدارہ جدا۔ سود جدا۔
مول جدا۔ بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گزارہ مشکل ہو گیا
روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجایش نکالوں، قہرِ درویش بجانِ
درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس
بائیس روپیہ مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا
کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے، جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔
بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض متفرق ادا ہو گیا
متفرق رہا خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے
وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی ان کو یہ عبارت پڑھا دینا .... میاں میں بڑی مصیبت میں
ہوں، محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپی کہتی ہیں:
ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے

گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کی ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

(۲۰۹) میاں تمہارے باپ کا تابع، تمہارا مطیع، فرخ مرزا کا فرماں بردار مگر ابھی آ بیٹھا ہوں اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام کا رقعہ پہنچ جائے گا۔ چھ جز تمہارے دیئے ہوئے میر مہدی حسین صاحب کو دئے اور باقی دن چڑھے اعیانِ مطبع جمع ہولیں تو وہ اوراق بھی منگا دوں۔

غالب

(۲۱۰) اقبال نشان والاشان صدرِ عزیز تر از جان مرزا علاء الدین خاں کو دعائے درویشانہ غالب دیوانہ پہنچے۔ سال گزشتہ تم کو یاد ہوگا۔ میں نے دستان فارسی کا تم کو جانشین و خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں۔ ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنی ثباتِ حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں

فنِ اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشیں ہو، چاہیئے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے تم کو مانیں کل شئے ھالک و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ ہجری ۲۱ جون ۱۸۶۸ء مقام دہلی۔

بنام مرزا امیرالدین احمد خاں المدعو بہ فرخ مرزا

(۲۱۱) اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشمِ جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشمِ جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاؤالدین خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا مجھ کو بہت پسند آیا۔ اُستاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفریں صد آفریں میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العالمین ہے یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمہارے پردادا حضرت فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرام گاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔ میاں تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دل دادہ ہوں۔ خبردار ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔ والدعا

دیدار کا طالب غالب

بنام میر احمد حسین المتخلص بہ میکش

(۲۱۲) بھائی میکش آفریں ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خر کے کس مزے کے ہو گئے

جن کی تاریخ ایسی ہے دیکھو صاحب ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ تاریخ دیکھی اُس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے اُس کی تعریف کریں گے۔ کہیں تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو، ابھی رقعہ لے کر آیا ہے ابھی خرمے لے کر آوے۔

(۲۱۳) میاں عجب اتفاق ہے نہ میں تمہارے دیکھنے کو آسکتا ہوں نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو وہ قدم رنجہ کہاں سے کرو سراپا رنجہ ہو لاحول ولا قوۃ یہ تعطیل کے دن کیا ناخوش گزرے۔ یوسف مرزا سے میر سرفراز حسین سے تمہارا حال سُن لیتا ہوں اور رنج کھاتا ہوں خدا تمہارے حال پر رحم کرے اور تم کو شفا دے خواہش یہ ہے کہ ناتوانی کا عذر نہ کرو اور اپنا حال اپنے ہاتھ سے لکھو والدعا۔

اسد

بنام جناب ماسٹر پیارے لال صاحب

(۲۱۴) کیوں صاحب ہم سے ایسے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا، خیر میری تقصیر معاف کرواؤ اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا جائے گا تو وہ گناہ میرا مجھ پر ظاہر کر دو تاکہ میں اپنے قصور پر اطلاع پاؤں۔ برخوردار ہیرا سنگھ تمہارے پاس پہنچتا ہے اور یہ تمہارا دست گرفتہ ہے، رہتک میں تم نے اسے نوکر رکھا دیا تھا۔ خیر وہاں کی صورت بگڑ گئی اب یہ غریب بہت تباہ ہے اور امور معاش میں سخت دل تنگ، تم ہی دستگیری کرو تو یہ سنبھلے ورنہ اس کا نقش ہستی صفحۂ دہر سے مٹ جائے گا والسلام۔ عنایت کا طالب غالب

(۲۱۵) فرزند ارجمند اقبال بلند بابو ماسٹر پیارے لال کو غالب ناتوان نیم جان کی دعا پہنچے۔ لاہور پہنچکر تم نے مجھے خط نہ بھیجا اس کی میں جتنی شکایت کروں بجا ہے، تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمھارا عاشق ہوں اور کیوں کر نہ عاشق ہوں صورت کے تم اچھے سیرت کے تم اچھے خالق نے خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔ اگر میرا صلبی فرزند ایسا ہوتا تو میں اس کو اپنا فخر خاندان سمجھتا اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو اس قوم اور اس خاندان کے ذریعہ افتخار ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔ میاں تم کو یاد ہے کہ میں نے تم کو سابق میں اس سے نورچشم مرزا یوسف علی خاں کے باب میں کچھ لکھا ہے، میرے اختلال حواس کا حال تم جانتے ہو۔ خدا جانے اس وقت کس خیال میں تھا اور میں کیا لکھ گیا وہ جو کچھ لکھا وہ سہل انگاری تھی، اب جو کچھ لکھتا ہوں راست گفتاری ہے۔ مختصر یہ یعنی مرزا یوسف علی خاں عزیز بڑے عالی خاندان اور بڑے بزرگ قوم کے ہیں، شاعر بھی بہت اچھے ہیں شعر خوب لکھتے ہیں صاحب استعداد ہیں، علم ان کو اچھا ہے، یہ بھی گویا فرقہ اہل علم و فضل میں سے ہیں اور ترقی کے قابل ہیں، نورچشم مولوی نصیر الدین کو میری دعا کہنا۔ محررہ ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء۔

بنام منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر

(۲۱۶) برخوردار کامگار سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر کو بلب گڈھ کی تحصیلداری مبارک ہو۔ پیپلی سے نوح آئے نوح سے بلب گڈھ گئے اب بلب گڈھ سے دلی آؤ گے۔ انشاءاللہ

بنام منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر

سنو صاحب حکیم مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان صاحب کے تمھارے علاقہ تحصیلداری میں بصیغہ طبابت ملازم سرکار انگریزی ہیں ان کے والد ماجد میرے پچاس برس کے دوست ہیں ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے لازم ہے کہ اُن سے یک دل و یک رنگ رہو اور اُن کے مددگار بنے رہو۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغہ دوام ہے تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی نہ ہوگی۔ صرف اس امر میں کوشش رہے کہ صورت اچھی بنی رہے سرکار کی خاطر نشان رہے کہ حکیم مرزا جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے۔

۲ر فروری ۱۸۶۴ء

بنام نواب یوسف علیخاں بہادر نواب رام پور

(۲۱۷) حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دئے ہیں، اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں پھر اس کو صاف کر کر بھیج دوں، ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہیگا

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے، ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجے۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب **غالب** روز یکشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء

(۲۱۸) ... میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو ملتوی چھوڑ کر کیوں کر آؤں۔ سنتا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۱۸۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اس کو روپیہ۔ جس کو جواب ملنا ہے اس کو جواب مل جائے۔

حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی، اور ان میں کلام خوش نہ تھا حضرت کا تو ان غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں

بقدر فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کرتا۔ زیادہ حد ادب۔ عرضداشتِ **غالب**

معروضہ جمعہ ۲۶ ربیع الثانی ۸۱ھ و ۳ ستمبر ۶۴ء

(۲۱۹) حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت! میں اس دولت ابد مدت کا ازراہِ مودت خیر خواہ ہوں۔ امر ملال انگیز اندوہ آور میں آرایش گفتار گوارا نہیں کر سکتا۔ نواب مرزا نے دلی آکر پہلے نوید بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں کل اس نے از روئے خطِ آمدِ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بطریق انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں۔

.... مرقومہ یکشنبہ ۱۲ شعبان و ۲۰ مارچ سال حال۔

(۲۲۰) .... میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست و دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغۂ سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نواب معلی القاب آئے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم کا ہکو تو میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدرداں جناب اڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے لفٹنٹ گورنر ہو گئے، وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گناہگار، مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مانے۔ بہرحال اس تشویش میں

راہِ چارہ مسدود اور دکھ موجود۔ عرفی غریب کہتا ہے:

مرا ز مائدۂ طنّاز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ ہاں سرے میخار

مرقومہ صبح یکشنبہ ۶ نومبر ۱۸۵۹ء

(۲۲۱) ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے، آٹھ سات برس سے مصدرِ خدمت اور شریکِ دولت ہوں۔ لازم کر لیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروں، اور کبھی کسی کی سپارش نہ کروں۔ بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اس کو میں سپارش سمجھا تھا۔ مخبر بنا۔ اور آپ کے اہلکاروں کو اس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبان مالک و حاکمان خود پر لازم ہے، سو بہ مقتضائے نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہو گیا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو واللہ باللہ اگر میں نے بھیجا ہو۔ نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میرن مرثیہ خواں اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس پانچ مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانہ دار، کوتوال، تحصیلدار نوکر ہیں میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں۔ کسی علاقہ پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا بہتر تھا۔ نہ ہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرّف ہونا تھا۔ سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا۔ میری طرف سے خاطر عاطر جمع رہے۔

ز سینہ تا بلبم سالہا نیابد راہ ہر آں نفس کہ رضائے تو اندر آں نبود

داد کا طالب غالب۔ دوشنبہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء

بنام نواب کلب علیخاں بہادر نواب رامپور

(۲۲۲) حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے میری عرضداشت کا جواب آ چکا ہے۔ بندہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو بیٹھ ورکار رہے اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ باقی جگر گداز ہوا جانستاں۔ امراض مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جز اعضائے انسان کہ وہ پسینے میں تر ہیں طراوت ورطوبت کا کہیں پتہ نہیں یا لو چلتی ہے یا مطلق ہوا نہیں۔ ان سطور کی تحریر سے مدعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد عطا ہوگا دعاگو پر احسان آپ کا ہوگا۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کی سلامتِ ذات اور اپنی نجات کا طالب

غالب - ۲۳ر جولائی ۱۸۶۵ء

(۲۲۳) حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبانِ فارسی و عبارت بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم دل نے قبول نہ کیا، آرائشِ گفتار نظماً او نثراً واسطے تہنیت کے ہے کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے۔ طبیعت راہ دیتی ہے۔ الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ۔ دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ مدار

طبع کے خلاف ۔ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اُس کے تذکرہ سے جی کیوں نہ بیقرار ہو۔ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہ ہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آئی ہوتی، تو مجھ سے زندگی دشوار تھی، یعنی حضور کو ابتدائی جلوس میں وہ رنج پہنچا، کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ پس و سادہ نشینی کی بدایت اور غمگینی کی نہایت یہ چاہتی ہے کہ اب مدۃ العمر ابداً موبداً حضرت کو کوئی غم نہ ہو۔ ہمیشہ جہاں دار و جہاں ستاں و شاد و شادماں رہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کے قدمبوس کا طالب

غالب ۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء

(۲۲۴) حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت ! بعد تسلیم معروض ہے ۔ عنایت نامۂ والا کے مشاہدہ نے مجھ کو میری حیات پر یقین عنایت کیا۔ اس سفر کا حال کیا عرض کروں، دلی سے رام پور تک ذوقِ قدمبوس میں جو آنا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا، اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بن مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینھ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہائے متواتر، منزلہائے نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوائے زمہریر کا جانگزار ہنا۔ بارے ہاپوڑ سے چل کر نیرِ اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دلی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا ہی توانا ہوں جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اس در پر پہنچوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب

غالب ۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۶ء

(۲۲۵) حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے۔ نمائش گاہ سراسر سوزِ نم کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں، کہ ہائے میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں، اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر۔ وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں۔ نہ پھر سکوں جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریق فرض محال ہے، ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں، اگر پسند آئے تو میں خوشنودیٔ مزاجِ مبارک سے اطلاع پاؤں۔ داد کا طالب

غالب ۔ ۱۴ ماہ اپریل ۱۸۶۷ء